زرنگار

تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور

زرنگار

از

جناب خان احمد حسین خانصاحب سب جج ریٹائرڈ

چیف ایڈیٹر شباب اُردو - لاہور

ناشران

تاج کمپنی لمیٹڈ - قرآن منزل - ریلوے روڈ

لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱	پالش والا	۵
۲	سوتیلا باپ	۱۶
۳	پیمانۂ صبر	۲۹
۴	دُودھ بھائی	۴۸
۵	بری کا تحفہ	۶۰
۶	کلثوم	۷۰
۷	دوزخ کا کُتا	۸۰
۸	ستم رسیدہ	۸۹
۹	بازار ستم	۹۹
۱۰	چٹائی والا	۱۰۸
۱۱	جواری کی موت	۱۲۰
۱۲	ایک عجیب موکّل کی کہانی	۱۳۰

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱۳	معافی	۱۵۲
۱۴	خنّاس	۱۶۳
۱۵	رمضان کبابی	۱۷۳
۱۶	آخری پرواز	۱۸۰

پالش والا

(۱)

رام رکھا تھا تو سب جج کا اردلی اور پندرہ روپے ماہوار کا ملازم مگر ٹھاٹھ سررشتہ داروں سے بھی بڑھ کر تھا۔ دروازے پر ہمیشہ ایک گائے اور ایک بھینس بندھی رہتی تھی۔ گھر میں کام کاج کے لئے ایک ٹھلیا بھی موجود تھا۔ بیوی سونے کے زیور سے پیلی ہو رہی تھی۔ مکونتی مکان زرخرید تھا۔ اِس آسودہ حالی کی وجہ یہ تھی کہ بالائی یافت ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار سے کم نہ تھی مثل خواں اور اہلمد اُس کے ہمراز اور پتی دار تھے۔ ہر نذرانہ یا نئی عرضی جو عدالت میں گزرے اُس کے لئے دو آنہ کی ہنڈوی تھی مدّعی یا مدعے علیہ جس کے حق میں فیصلہ ہو جب تک اُسے چونّی نہ دے اپنا دامن نہ چھڑا سکتا تھا۔ کئی من چلے سائل تو ایک روپے سے دو روپے

تک دے ڈالتے تھے۔ اِس طرح اُسے چار پانچ روپے روزمرّہ آجاتے تھے۔ جس دن صرف تین روپے آئیں وہ دن اُس کے لئے منحوس تھا۔ رام رکھّا کی عُمر تو پچاس سال کے قریب تھی مگر اولاد صرف ایک نوعمر بیٹا ہری چند تھا۔ جسے اُس نے ناز و نعمت سے پالا تھا اور جسے وہ آنکھ کا تارا سمجھتا تھا۔ اردلی کی اَن پڑھ بیوی وید کور کہا کرتی تھی کہ "میرا بیٹا پرمیشر کی دیا سے ایک دن جج برسٹر ہوگا" چنانچہ وہ بیٹے کا نام کبھی نہ لیتی تھی۔ ہمیشہ جج برسٹر کہہ کر پکارتی تھی۔

(۲)

ہری چند نے باپ کے سائے میں پرورش پا کر سولہ[۱۶] سال کی عُمر میں انٹرنس یعنی میٹرک پاس کیا۔ اردلی نے بہت خوشی منائی اور اُسی سال بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی دوستوں کو پُرتکلّف دعوت دی۔ لاہور کی مشہور رنڈیاں نچائیں۔ بھانڈ اور نقال بُلوائے اور اپنی ناجائز کمائی کا بہت سا حصّہ برباد کر دیا ہری چند کی دُلہن جس کا اصلی نام تو ہمیں معلوم نہیں مگر میکے والے "اُمّاں" کہہ کر پکارتے تھے۔ نہایت خوبصورت گویا پری پیکر اور حُور شمائل تھی۔ اُس کا باپ لالہ دیوی داس بزاز ہٹّہ میں دیسی کپڑے کی دُکان کرتا تھا اور اپنی دال روٹی میں خوش تھا۔ شادی کے بعد اُس نے سمدھی کو بہت سمجھایا کہ دیکھو زمانہ نازک

ہے ہر سال ہزاروں نوجوان بی۔ اے اور ایم۔ اے ہو کر گلیوں کی خاک چھان رہے ہیں اور نان شبینہ کو محتاج ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں آجکل روزگار ملنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے میرا کہا مانو تو ہری چند کو کسی کام میں لگاؤ یا کاریگر بناؤ تجارت یا نیچ بیوپار سب سے بہتر ہے مگر اردلی کے دماغ میں دو دنخوت بھرا ہُوا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ دن ہمیشہ یُوں ہی رہیں گے اِس لئے وہ بمدھی کی گفتگو سُن کر ہنس دیا اور جب وید کورسے ذکر آیا تو وہ ناک بھوں چڑھا کر بولی "اے واہ میرا بچہ دُکان پر بیٹھ کر ترازو اور بٹّوں سے ہاتھ میلے کرے وہ تو جج اور برسٹر ہو گا"۔

(۳)

ہری چند کی شادی کو دو سال گزرے تھے کہ وہ ایک بچّے کا باپ ہو گیا۔ یکایک گردش زمانہ رنگ لائی۔ اتّفاق سے لاہور میں ایک ایسا جج تبدیل ہو کر آیا۔ جو نہ صرف بیدار مغز بلکہ رشوت کا بھی دشمن تھا۔ وُہ رام رکھا کی کارروائیوں سے بہت بیزار ہُوا اور اُسے دفتر میں بھجوا دیا۔ کہاں عدالت کے گلچھرّے اور کہاں دفتر کی بستہ برداری۔ دو ہی مہینوں میں میاں اردلی کی چیں بول گئی۔ اہل دفتر کی جھڑکیاں اور سخت کلامی وہ برداشت نہ کر سکا۔ مجبوراً بے سوچے سمجھے چھ ماہ کی رُخصت لے لی۔

اُس کی غیر حاضری میں سرِ دفتر نے ایسا اُمیدوار اس کا قائم مقام بنایا جو اُس کے بہت مُنہ لگا ہُوا تھا۔ اب اُسے یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح رام رکھا نکلے اور اُس کا اپنا آور دہ مُستقل ہو جائے۔ میعادِ رُخصت ختم ہونے پر جب وہ نوکری پر حاضر ہُوا تو سرِ دفتر نے اُس کا ناک میں دم کر دیا۔ آخر جھُوٹا الزام لگا کر موقُوف کرا دیا ؛

(۴)

موقُوفی کے بعد پھر رام رکھا کو نوکری نہ ملی وہ خانہ نشین ہو گیا اور عالمِ یاس میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ آمدنی کے تمام دروازے یک قلم مسدود ہو گئے اور چونکہ ہری چند کی تعلیم کالج میں جاری رہی اخراجات بہت بڑھ گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ پہلے گائے بِکی پھر بھینس فروخت ہوئی پھر چاندی اور سونے کے زیور ایک ایک کر کے نذرِ صراف ہوئے اور جب ہری چند نے بی۔ اے کا گون زیبِ تن کیا تو سکونتی مکان رہن ہو چکا تھا اور اس کے در و دیوار پر مُفلسی و ناداری برس رہی تھی مگر بیٹے کی گون پوشی نے پھر اُمید کی جھلک دکھائی اور از سرِ نو ڈھارس بندھائی۔ رام رکھا جھونپڑی میں بیٹھ کر محلّوں کے خواب دیکھنے لگا۔ اب وُہ اِس خیالِ خام میں تھا کہ بیٹا بی۔ اے ہے اگر ڈپٹی نہیں جب جج نہیں تو تحصیلدار ضرور ہو جائیگا۔ اب عنقریب دِن پھرا چاہتے ہیں

اب مکان واگزار ہو کر پھر لہر بہر ہو جائے گی +

(۵)

لیکن اُمید کا گھر خالی ہوتا ہے سہ

شطرنج روزگار میں شاطر جہان کے   خالی ہمیشہ دیکھتے ہیں گھر اُمید کا

ہری چند نے ہر چند پاپڑ بیلے کئی جتن کئے مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا نوکری نہ ملنی تھی نہ ملی وہ جہاں جاتا تھا ٹکا سا جواب ملتا تھا۔ ایک دن اُس نے اخبار میں اشتہار دیکھا کہ ہائی کورٹ کے دفتر میں ایک کلرک مطلوب ہے تنخواہ چالیس روپے ماہوار دی جائے گی اُمیدوار کم سے کم بی۔اے ہو جُملہ درخواستیں ماہ رواں کی دس تاریخ تک رجسٹرار صاحب بہادر کے پاس پہنچ جائیں ورنہ ان پر غور نہ ہو گا۔ یہ اعلان دیکھ کر مُفلسی اور ناداری کا ستایا ہُوا ہری چند ہائی کورٹ میں گیا ور جب درخواست پیش کی تو معلوم ہُوا کہ اس کی درخواست سے پہلے دو سَو عرضیاں گزُر چکی ہیں اور سائلوں میں بیس اُمیدوار ایسے ہیں جو بی۔اے کے ساتھ ایل۔ ایل۔بی بھی ہیں۔ صاحب رجسٹرار اس میں سے تیس عرضیاں چھانٹیں گے اور ان تیس کا امتحان مقابلہ ہو گا جو اوّل رہے گا اسے اسامی دی جائے گی۔ یہ سُن کر ہری چند کا جی ڈُوب گیا۔ وہاں اُسے کسی نے یہ بھی بتایا کہ مُلتان میں ایک بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

سب جج کا مثل خواں ہے اور محکمہ ریل میں کئی بی۔ اے جو ایل۔ ایل۔ بی بھی ہیں گارڈ ہیں ؛

(۶)

جب ہری چند ہائی کورٹ سے ملول و محزوں واپس آیا تو رام رکھّا اور اُس کی بیوی بیٹھے خیالی پلاؤ پکا رہے ہے اور فرزند دلبند کے مستقبل پر بحث کر رہے تھے۔ بیٹے کا چہرہ اُترا ہُوا دیکھ کر وِید کور نے کہا "بیٹا کہاں گئے تھے؟ اِس وقت بہت اُداس دکھائی دیتے ہو اب ایشور کی کرپا سے کب جج برشٹر ہو گے؟" یہ سُن کر بیٹے کو غصّہ آ گیا۔ مایوسی اور ناکامی نے اُسے حواس باختہ کر رکھا تھا جھلّا کر بولا "ماتا یہ کیا بے تُکی باتیں کر رہی ہو۔ برشٹر کس جانور کا نام ہے۔ اگر برشٹر سے تمہاری مُراد بیرسٹر ہے تو مُنہ دھو رکھو بیرسٹر تو بیرسٹر مجھے تو بیرسٹر کا منشی بھی کوئی نہیں رکھتا اور جج کی ایک ہی کہی مجھ جیسے چپڑ قناتی بدبخت اور نالائق کو جج کون بنائیگا۔ ہاں البتّہ کوئی جج مجھے پاٹ صاف کرنے پر نوکر رکھ لے تو رکھ لے لیکن اس کی بھی اُمید نہ رکھو۔ اگر کسی مہتر کو خبر ہو گئی کہ ایک بی۔ اے خاکروبی کا اُمیدوار ہے تو جھاڑو لے کر میری کھال اُدھیڑ دیگا" یہ جواب سُن کر وِید کور دم بخود رہ گئی اور اُماں جو اب تین بچوں کی ماں تھی رونے لگی ؛

(۷)

چھ ماہ اور گزر گئے اور ہمارے بدنصیب بی۔ اے کو کہیں روزگار نہ ملا۔ آخر بیکاری سے اُکتا کر وہ ایک دن کپتان پولیس کی خدمت میں حاضر ہُوا اور کہا۔ مجھے پولیس میں بھرتی کر لیا جائے۔ صاحب نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا "ویل تم زرد ہے۔ کمزور ہے۔ دُبلا پتلا آدمی ہے پولیس کے لئے طاقتور۔ مضبُوط۔ چُست اور چالاک آدمی چاہیئے۔ ہم کو تمہارے جیسا آدمی نہیں چاہیئے۔ تمہاری آنکھوں پر عینک ہے۔ تمہاری نظر کمزور ہے تم کو، ہم کانسٹبل کی جگہ بھی نہیں دے سکتے۔ جاؤ اور کہیں دفتر میں قسمت آزماؤ" یہ دِل شکن اور رُوکھا پھیکا جواب ہری چند کو بہت ناگوار گُزرا اور جل بُھن کر بولا "ہاں صاحب آپ سچ کہتے ہیں آپ کی پولیس میں ایک گریجویٹ کے لئے جگہ نہیں کیونکہ وہ دیانتدار ہے۔ رشوت نہیں لیگا۔ حلف دروغی نہیں کریگا۔ جھُوٹی شہادت نہیں بنائے گا" یہ جواب سُن کر کپتان پولیس آگ بھوکا ہو گیا۔ بجلی کی طرح کڑکا اور رعد کی طرح گرج کر بولا "کوئی ہے اس بدمعاش کو گردن سے پکڑ کر کچہری کے احاطہ سے باہر نکال دو" صاحب کے حُکم کی دیر تھی ایک گراں ڈیل سپاہی بھیڑئے کی طرح جھپٹا اور ہری چند کو دھکے دیتا ہُوا سڑک تک لے گیا ✤

۸

رام رکھا کے تمام ہوائی قلعے رفتہ رفتہ منہدم ہو گئے۔ سب اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ دل ٹوٹ گیا۔ بال غم والم سے بگلے کے پر کی طرح سفید ہو گئے۔ کمر خم ہو گئی اور وہ یدکور بہو اور پوتوں کی تکلیف نہ دیکھ سکی۔ جب وہ بیٹے کو اُداس بہو اور اُس کے بچوں کو میلا کچیلا پیاسا دیکھتی تھی تو اُس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے تھے۔ آخر انسان تھی کب تک یہ صدمات برداشت کرتی۔ اُس کے سینے میں جگر تھا پتھر نہ تھا جو رفتہ رفتہ چھلنی ہوتا گیا اور وہ گھُل گھُل کر دُنیا سے رُخصت ہو گئی اس پر ستم یہ ہوا کہ مُرتہن جسے کئی سال کا سُود نہ ملا تھا جامے سے باہر ہو گیا نالش داغ دی اور ڈگری حاصل کر کے مکان قُرق اور نیلام کرا لیا۔ پھر بولی دے کر خود کوڑیوں کے مُول خرید لیا۔

(۹)

گھر والی کی وفات اور گھر سے بے دخلی ایسے صدمات تھے کہ رام رکھا برداشت نہ کر سکا وہ زندہ تھا مگر مُردوں سے بدتر اُس کا دماغ چل گیا۔ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ آپ سے آپ ہنستا اور آپ سے آپ رونے لگتا تھا۔ ہری چند کو جب مُرتہن نے مشتریٔ نیلام بن کر بے دخل کیا تو اُس کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ پیشگی کرایہ دے کر

کہیں سر چھپاتا۔ اُماں کے پاس زیور تو کیا پیتل کا چھلا بھی نہ تھا صرف ایک دھوتی رہ گئی تھی جسے وہ میلی ہو جانے پر دھو لیتی تھی۔ ناچار وُہ خاوند کے باپ اور تین بچّوں کو اپنے میکے لے گئی۔ اُماں کا باپ ایک معمولی بزاز تھا اُس کے کئی بچّے تھے پھر بھی وہ بڑی مروّت سے پیش آیا۔ سمدھی۔ بیٹی۔ داماد اور نواسوں کو اپنے مکان میں دو کوٹھریاں دیدیں لیکن ہری چند کو سُسرال میں قیام ایک آنکھ نہ بھاتا تھا وُہ شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا لیکن کیا کرتا مجبُور تھا۔ خدا کی قُدرت اور زمانے کے انقلاب کو دیکھئے۔ معمار۔ مزدُور۔ تانگے والے۔ درزی۔ گاڑی بان۔ اور ریل کے قُلی روزی کما رہے تھے اور ان کی لوگوں کو ضرورت تھی لیکن ایک بی۔ اے کوڑی۔ کوڑی کو ترستا تھا اور اُس کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ چنے چبا کر پیٹ کی آگ بجُھائے۔ اُمّاں جیسی خوبصورت تھی ویسی نیک سیرت بھی تھی وُہ ہر وقت خاوند کی دلجوئی کیا کرتی تھی خاوند بیکار رہتا تھا لیکن وہ سینا پرونا کر کے ضروریات روزمرہ مہیّا کرتی تھی اور کہتی تھی "میرے پیارے دھرم تی گھبراؤ نہیں جب پہلے دن نہیں رہے تو یہ بھی نہیں رہیں گے۔ لیکن ہری چند کو یہ غم اندر ہی اندر کھا رہا تھا کئی بار اُس نے چاہا کہ خودکشی کر لے ریل کی سڑک پر لیٹ کر اس عذاب سے نجات پا لے لیکن

جب وُہ باولے باپ۔ مہ لقا بیوی اور گُل رُخسار بچّوں کی طرف دیکھتا تھا اُس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا تھا +

(۱۰)

آخر وُہ کب تک یہ حالت برداشت کرتا ایک دن اُس نے جھنجھلا کر خودکشی کا پُختہ ارادہ کر لیا اور جب شام ہوئی تو بیٹھے بیٹھے اُٹھا پہلے تینوں بچّوں کو چُوما اور پیار کیا۔ پھر بیوی کو گلے سے لگا کر کہا مَیں سفر پر جا رہا ہوں دیکھنا میرے بعد انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اچھّی طرح رکھنا۔ اُمّاں یہ سُن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بولی "دیکھو جی ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ روزی دینے والا ایشور پرماتما ہے جو ہماری قسمت میں ہے وہ یہیں مل جائیگا۔ بچّوں کو تم سے بہت محبّت ہے وہ تمہاری جُدائی برداشت نہیں کر سکتے اور مَیں بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی" بیوی کی جگر خراش گفتگو سُن کر ہری چند قریب تھا کہ دیوانہ ہو جائے مگر اُس نے اپنے آپ کو بمشکل سنبھالا اور بیوی کو روتا چھوڑ کر زبردستی گھر سے نکلا۔ لیکن اس وقت اس سے چلا نہ جاتا تھا۔ پاؤں سو گئے۔ ایک ایک قدم سَو سَو من کا ہو گیا +

(۱۱)

ہری چند کی قسمت میں حرام موت مرنے کا گناہ نہ لکھّا تھا وُہ

قدم اُٹھائے دریائے راوی کی طرف ڈُوبنے جا رہا تھا کہ راہ میں اُسے ایک سادھو ملا جو اُس کے ساتھ ہولیا۔ باتوں باتوں میں اُسنے کہا "بڑے بُزدل ہیں وہ لوگ جو مصیبت سے گھبرا کر جان پر کھیل جاتے ہیں اگر محنت سے حق حلال کی روزی کمائی جائے تو اس میں کوئی عیب نہیں ایک چمار۔ ایک بھنگی۔ ایک خاکروب اگر وہ دیانتدار ہے تو ایک رشوت لینے والے جج اور بے ایمان ساہوکار سے بہتر ہے اگر تمہیں کوئی پیشہ نہیں آتا تو جاؤ بُوٹ پالش کرو مگر جان گنوا کر مردانگی کے نام کو بٹہ نہ لگاؤ"۔ یہ کہا اور ہری چند کو ایک لفافہ دے کر رخصت ہُوا۔ جب سادھو اُس کی نظر سے غائب ہو گیا تو اُسنے لفافہ کھولا۔ اس میں پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ ہری چند نوٹ واپس کرنے کی نیّت سے سادھو کے تعاقب میں دوڑا اگر وہ اسے نہ ملا پر نہ ملا۔ علے الصباح اُس نے نوٹ تڑوا کر ایک چمڑے کا بیگ۔ بُرش اور پالش کا سامان خریدا۔ پھر بیگ پر یہ الفاظ لکھوائے

"ہری چند بی۔ اے پالش والا"

اب وہ ہر روز ریلوے سٹیشن کے قریب بیٹھا دیکھا جاتا ہے اور مُسافروں کے بُوٹ صاف کرتا ہے۔ اس طرح جب شام کو گھر آتا ہے تو اُس کی جیب میں کبھی روپے کی اور کبھی ڈیڑھ روپے کی ریزگاری ہوتی ہے اور وہ اُمّال لوگوں کے کپڑے سی کر تیس چالیس روپے کما لیتی ہے +

سوتیلا باپ

(۱)

سائرہ اور ہاجرہ دو بہنیں تھیں۔ اور کشمیر میں رہتی تھیں۔ سائرہ بڑی تھی اور ہاجرہ چھوٹی۔ سائرہ کی عمر بتیس اور ہاجرہ کی اکیس سال کی تھی۔ سائرہ کی شکل سیدھی سادی اور رنگ سانولا تھا۔ وہ بیس سال کی تھی۔ کہ وہ بیوہ ہوگئی۔ اور پھر شادی نہ کی۔ ہاجرہ حسین اور مہ جبین تھی۔ اُس کے گال سیب سمرقند کو شرماتے تھے۔ خاوند گلہ بان تھا۔ وہ اٹھارہ سال کا خوبصورت کشمیری تھا۔ اور ہاجرہ سولہ سال کی تھی۔ کہ دونوں کی شادی ہوئی۔ دونوں میں گُل و بُلبُل کی محبت تھی۔ پانچ سال جاتے دکھائی نہ دئے۔ آہ سُکھ کا زمانہ کس طرح جلد گُزر جاتا ہے۔ اور دُکھ کے ایّام کاٹے نہیں کٹتے۔ ایک ایک رات پہاڑ بن جاتی ہے۔ اور ایک ایک دن ایک ایک صدی۔ محبّت کی بدولت ستار بٹ اور

ہاجرہ کا گھر پانچ سال فردوس بنا رہا۔ یکایک انقلاب کا زلزلہ آیا۔ جس نے مسرت کے قصر کو گرا کر اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ایک دن ستار بٹ درخت پر چڑھا بکریوں اور بھیڑوں کے لئے پتے جھاڑ رہا تھا۔ کہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سر کے بل گرا۔ گرتے ہی سر ایک پتھر کے ساتھ اس طرح ٹکرایا۔ کہ بھیجا نکل آیا اور وہ فی الفور جان بحق تسلیم ہوا۔ اُس کی وفات کے وقت سلطان بٹ اُس کا اکلوتا بیٹا صرف چار سال کا تھا جس وقت ستار بٹ کو اُٹھا کر گھر لائے۔ ہاجرہ ہکا بکا رہ گئی۔ چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ اور وہ پیکر مرمر بن گئی لوگ روتے تھے اور وہ خاموش تھی۔ کیا مجال کہ آنکھوں سے ایک آنسو بھی نکلا ہو۔ ہمسایوں میں سے بڑی بوڑھی عورتیں اسوقت موجود تھیں یک زبان ہو کر بولیں۔ اب یہ بھی نہیں بچے گی۔ اگر یہ بھی مر گئی تو سلطان کا کیا حال ہو گا۔

(۲)

مگر ہاجرہ زندہ رہی ابھی زندگی کے ایّام باقی تھے۔ جس وقت اُس کے شوہر کو دفن کرنے لے چلے تو یکایک اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔ اور روتے روتے اُس کی گھگی بندھ گئی۔ اُسے روتا دیکھ کر بڑی بوڑھی عورتوں کو اطمینان ہو گیا۔ اور پھر یک زبان ہو کر بولیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ رو رہی ہے۔ ورنہ جان کا خطرہ تھا۔ اب نہیں مرے گی۔ واقعی

ہاجرہ کے آنسو آبِ حیات کا کام دے رہے تھے۔ آنسوؤں کی جھڑی سے غم کی آگ جو اُس کے نخلِ ہستی کو جلا رہی تھی۔ بُجھ گئی اور اسے کسی قدر تسکین ہو گئی۔ واقعی دل کا بُخار نکل جائے تو اضطراب کم ہو جاتا ہے۔ سائرہ اپنی بہن ہاجرہ سے ناراض تھی۔ اُس نے چھوٹی بہن سے مِلنا جُلنا ترک کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ بنتا ربٹ ایک معمولی چرواہا تھا اور وہ اپنی چندے آفتاب۔ چندے ماہتاب بہن کو اس قابل سمجھتی تھی کہ کسی امیر کی بیگم بنے۔ مگر ہاجرہ جو محبّت کی کنیز تھی۔ محبّت کے مقابلے میں تمام جہان کی شہنشاہی کو ہیچ سمجھتی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں ایک غریب چرواہے کی کُٹیا قصرِ جنّت تھی۔ لیکن جب اُسے بہنوئی کی مرگ مفاجات کی خبر ہوئی۔ تو خُون نے جوش مارا۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اور بہن کی تنہائی۔ بیکسی اور بیوگی کا خیال کر کے اُس کے پاس آ گئی اور مُستقل طور پر آ گئی ؂

(۳)

مُصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ خاوند سے دائمی مفارقت کا ہاجرہ کو اتنا صدمہ ہُوا۔ کہ وہ بیمار ہو گئی اور بیماری میں کچھ بھیڑیں اور بکریاں تو نے پونے بِک گئیں۔ اور جو باقی رہیں۔ وہ وبا کا شکار ہو گئیں۔ جب ہاجرہ بیماری سے اُٹھی۔ تو اسے اطّلاع ملی۔ کہ ایک رات میں بیس بھیڑیں

ہلاک ہو گئیں۔ شام کو جب اُنہیں باڑے میں بند کیا گیا تو بھلی چنگی تھیں۔ صُبح دیکھا تو سب مری پڑی تھیں۔ اور اُن کے گلے سُوجے ہُوئے تھے۔ اب ایک طرف خاوند کی موت کا غم اُسے ستا رہا تھا۔ دُوسری طرف ناداری جان کھا رہی تھی۔ ناچار اب دونوں بہنیں سینا پرونا اور کشیدہ کاری کر کے پیٹ پالتی اور سُلطان بٹ کی پرورش کرتی تھیں۔ دس سال اسی طرح گزُر گئے۔ اور سُلطان چودہ سال کا ہو گیا۔ یتیموں میں کوئی ہی قسمت والا بچّہ اس قابل ہوتا ہے کہ کچھ بن کر دکھائے۔ سُلطان کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ چکا تھا۔ ماں اور خالہ اُسے بیحد پیار کرتی تھیں۔ اُن کے بیجا لاڈ نے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔ وہ کام چور۔ کاہل اور ڈھیٹ ہو گیا۔ وہ کوئی کام نہ کرتا تھا۔ سارا دن جنگلوں میں پھرتا۔ اور پرندوں کے گھونسلوں سے انڈے نکالا کرتا۔ دس سال کے بعد ایک اور مُصیبت آئی۔ ہاجرہ کی آنکھوں میں بظاہر تو کوئی فرق نہ آیا۔ وہ پہلے کی طرح خوبصورت تھیں۔ اور یُوں اُسے سب کچھ دکھائی دیتا تھا۔ مگر باریک کام نہ ہو سکتا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ اکثر ستار بٹ کو یاد کر کے رویا کرتی تھی اس کی بصارت میں یہ فرق آ گیا۔ کہ وُہ اب ریشم کا باریک کام بالکل نہ کر سکتی تھی۔ اِس آفتِ ناگہانی سے اُس کی آمدنی میں بہت کمی واقع ہوئی۔ اور وہ گویا نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئی۔

اگر سائرہ کی مدد نہ ہوتی تو خدا جانے کیا ہوتا ؎

(۴)

ایسے نازک وقت میں جب مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ خدا نے جو بڑا کارساز ہے ایک موکّل بھیج دیا جب ہاجرہ کنواری تھی تو میاں صمدو ایک دولت مند سوداگر جس کا پشمینہ کا کارخانہ تھا۔ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اُس وقت ہاجرہ کے دل میں ستار بستا تھا۔ اس لئے اُس نے میاں غلام صمدانی عُرف میاں صمدو کی درخواست کو منظور نہ کیا۔ اب کہ مُفلسی و ناداری نے اُسے حد سے زیادہ پریشان و حیران کر رکھا تھا۔ اور کوئی ایسا نہ تھا کہ سُلطان کی دستگیری کرتا۔ اُس نے میاں صمدو کو دوبارہ جواب دینا پسند نہ کیا۔ اور بادلِ ناخواستہ اس سے نکاح کر لیا۔ اگر ہاجرہ کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی۔ تو اِس شاندار عقد پر پھُولی نہ سماتی اور شوہر کے گھر ہنستی ہوئی جاتی۔ مگر ستار کی محبّت اُس کی رُوح تھی۔ وہ مغموم اور ملول۔ بادل بریاں و چشم گریاں دوسرے شوہر کے گھر گئی اور سُلطان کو ہمراہ لے گئی۔ سائرہ پھر اکیلی رہنے لگی ؎

(۵)

ہاجرہ کو میاں صمدو، ملک التجار میاں صمدو سے محبّت نہ تھی کہتے ہیں کہ محبّت صرف ایک دفعہ ہوتی ہے اور پھر نہیں مرتی کبھی زائل

نہیں ہوتی۔ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر ہمارا تجربہ اس کے خلاف ہے ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ زن اور مرد جو ایک دُوسرے پر جان قربان کرتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے ہیں جن کی محبت شمع اور پروانے کو شرماتی ہے۔ جب بدلتے ہیں۔ تو اجنبی بن جاتے ہیں۔ دُشمن ہو جاتے ہیں۔ بیری بن کر رہتے ہیں۔ اور وہ تعلق جسے محبت کہا جاتا ہے۔ حقارت اور نفرت میں بدل جاتا ہے۔ ہاجرہ کو میاں صمد و سے محبت نہ تھی۔ مگر وُہ ایک فرمانبردار۔ خدمت گزار اور غمگسار بیوی تھی وہ خاوند کو خوش رکھنے کی حد سے زیادہ کوشش کرتی تھی۔ اور میاں صمدو اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ وہ بھی ہاجرہ پر جان چھڑکتا تھا اور اس کے لئے اشرفیاں کوڑیوں کی طرح لٹاتا تھا۔ اور بیوی کی خاطر اپنے سوتیلے بیٹے سُلطان کی اپنے سگے بچوں کی طرح پرورش کرتا تھا۔ لیکن سُلطان سے اُس کی ماں کو بیحد محبت تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سُلطان اپنے پدرِ مرحوم کا بالکل ہمشکل تھا۔ سر مو فرق نہ تھا اور یہ بات میاں صمدو کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی وہ سُلطان سے ہمیشہ پرے پرے رہتا تھا اور جب کبھی گفتگو کا موقع آتا تو درشت کلامی سے پیش آتا تھا۔

(۶)

ایک دن کا ذکر ہے کہ میاں صمدو کسی ناشائستہ حرکت کی وجہ سے

سُلطان پر خفا ہو رہا اور اُسے سخت سُست کہہ رہا تھا۔ کہ ہاجرہ آگئی اُس نے سُلطان کی جیسا کہ ماؤں کا خاصہ ہے۔ طرف داری کی۔ جس سے میاں صمدو کا غُصّہ اور بھی بھڑک اُٹھا۔ اور اُسے طیش آگیا۔ وہ ہمیشہ بیوی کی فرمانبرداری کرتا اور اُسے اپنی رُوح رواں سمجھتا تھا۔ لیکن اسوقت اس کے مُنہ سے ہاجرہ کے رُوبرو چند ایسے الفاظ نکل گئے جن کا اُسے بعد ازاں غُصّہ فرو ہونے پر رنج ہُوا۔ اُس نے جوش میں آکر کہا:۔ "یہ لڑکا حد سے زیادہ شریر اور نامُراد ہے۔ مَیں نے ایک رذیل گڈریئے کے بیٹے کو ناحق اپنے گھر میں رکھ کر دردِ سر مُول لیا۔ یہ میرا کیا لگتا ہے۔ اسے کہہ دو میرے سامنے نہ آیا کرے"۔ اِن الفاظ سے ہاجرہ کے زخمِ دل آبلے ہو گئے۔ شمشیر اور خنجر۔ چھُری اور کٹاری کا زخم اچھّا ہو جاتا ہے۔ مگر زبان کا گھاؤ اچھّا نہیں ہوتا۔ ہاجرہ جوان ایام میں دو جان سے تھی رونے لگی۔ سُلطان کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اور سینے سے لگا کر بڑی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ اس صدمے سے اُسے دردِ زہ شرُوع ہو کر قبل از وقت ایک لڑکا پیدا ہُوا۔

(۷)

سب جانتے ہیں کہ پھل جب پکتا ہے تو خود بخود شاخ سے گر پڑتا ہے یا آسانی سے توڑا جا سکتا ہے لیکن خام میوہ بمشکل شاخ سے جُدا

ہوتا ہے۔ کئی بار کچّے پھل کو ٹہنی سے جُدا کرتے ہوئے خود ٹہنی ٹوٹ جاتی ہے۔ اِس بچّے کی قبل از وقت پیدائش سے ہاجرہ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ایک رات تو ڈاکٹروں نے مایوس ہو کر جواب دیدیا۔ مگر ڈاکٹر کوئی غیب دان نہیں ہوتے۔ اُن کا خیال غلط ثابت ہوا۔ ورنہ میاں صمدو ضرور دیوانہ ہو جاتا۔ اِس وقت اگر اُسے کوئی کہتا کہ تم پہلو چیر کر اپنا دل نکالو۔ اور اس کے سکّے بنا کر ہمیں دو۔ تو وہ اپنی بیوی کی زندگی کی خاطر کبھی دریغ نہ کرتا۔ چھ ماہ تک موت اور حیات میں کشمکش جاری رہی۔ کبھی مایوسی کی تاریکی چھا جاتی۔ اور کبھی اُمید جھلک دکھانے لگتی۔ چھ ماہ کے بعد ہاجرہ چلنے پھرنے کے قابل تو ہوگئی۔ مگر اب وہ اگلی سی ہاجرہ نہ تھی۔ اِس ہچکولے سے جہاز کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے تھے وہ ایک دن اچھّی تو دو دن بیمار رہتی تھی۔ میاں صمدو اِس تکلیف کا ذمّہ دار سُلطان کو سمجھتا اور اپنے خاص خاص دوستوں سے کہا کرتا۔ کہ یہ تمام مُصیبت اِس نامُراد و منحوس لڑکے کی مہربانی ہے۔ اسی کی وجہ سے اس کی ماں کو تکلیف ہوئی۔ اور غلام ربّانی قبل از وقت پیدا ہُوا۔ جس سے میری دِلنواز اہلیہ کی صحت برباد ہو گئی ؀

(۸)

دو سال گزر گئے اور غلام ربانی جسے انّا نے دودھ پلا کر پالا تھا۔

دو سال کا ہو گیا وہ سُلطان جیسا خوبصورت تو نہ تھا۔ مگر اچھا موٹا تازہ بچّہ تھا۔ اور باپ جب تک اُسے دیکھ نہ لے اُسے چین نہ آتا تھا۔

دو سال گزر گئے اور یہ میعاد ہاجرہ نے دواؤں کے بل پر گزاری۔ میاں صاحب نے اس کے لئے ہزاروں روپے صرف کر کے انگلستان۔ فرانس اور امریکہ سے پیٹنٹ دوائیں منگوائیں۔ مگر جب دیوار کو دیمک لگ جائے۔ تو وہ کسی حال میں قائم نہیں رہ سکتی۔ دو سال گزرنے پر ہاجرہ کی حالت نے یکایک پلٹا کھایا۔ اور وہ صاحب فراش ہو گئی جب زندگی سے نا اُمید ہو گئی۔ تو اُس نے خاوند کو بُلا کر کہا "سُلطان کہاں ہے اُسے میرے پاس لاؤ" میاں صاحب دل میں سُلطان کو کوستے ہوئے باہر گئے۔ اور اُسے ہمراہ لے آئے۔ پھر اُس نے خادمہ کو بھیج کر چھوٹے بیٹے غلام ربانی کو بُلایا۔ اور اپنے فراخ پلنگ پر ایک طرف سُلطان کو اور دُوسری طرف ربانی کو لٹا کر ربانی کا ہاتھ سلطان کے ہاتھ میں دیا مسکرائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ آہ وہ آنکھیں پھر نہ کُھلیں اور ہاجرہ کا مُرغ رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اُس کی وفات کے بعد ربّانی کی پرورش سائرہ کے سپرد ہوئی اور وہ میاں صمدو کے گھر میں رہنے لگی ٭

(۹)

سولہ سال گزر گئے۔ غلام ربانی کی عمر اب اٹھارہ سال کی ہو گئی۔ اور سلطان کی بتیس برس کی۔ ہاجرہ کی وفات کے بعد بہت جلد میاں صمدو کے بال سفید ہو گئے۔ اور وہ ساٹھ سال کی عمر میں اسی سال کا پیر فرتوت بن گیا۔ وہ اب اپنے کاروبار میں دولت کمانے کو بدستور مشغول تھا۔ مگر چراغ مسرت ہمیشہ کے لئے گل ہو چکا تھا۔ سولہ سال گزر گئے تھے۔ اور ہاجرہ کی یاد اس کے دل میں ہر وقت تازہ تھی۔ ربانی اُس کی آنکھوں کا تارا اور اُسے جان سے بڑھ کر پیارا تھا۔ مگر سلطان سے بدستور نفرت تھی۔ وہ بیوی کی یاد میں اُسے تنگ تو نہ ہونے دیتا۔ اور اُسے اُس کی ضروریات سے بڑھ کر دیتا تھا۔ مگر سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔ سلطان نے ایک جھاڑی کتا پال رکھا تھا۔ اگر وہ کتا اس کے سامنے آجائے۔ تو اُسے ایک ڈک جماتا اور ڈنڈا لے کر مارنے دوڑتا تھا۔ ربانی جانتا تھا کہ سلطان کا باپ اور ہے اور وہ صرف ماں کی طرف سے میرا بھائی ہے۔ اِس لئے وہ اس سے محبت تو کرتا تھا لیکن اِس علم سے کہ وہ میاں صاحب کی بے شمار دولت کا واحد مالک ہے۔ اور اس میں سلطان کا کوئی حصہ نہیں اپنی مشیخت جتانے سے نہ رکتا تھا۔ اور ہنگام گفتگو نخوت سے پیش آتا تھا ÷

(۱۰)

ربانی کو شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن وہ بندوق لے کر جانے لگا۔ تو باپ نے منع کیا اور کہا آج نہ جاؤ۔ آج آسمان کا چہرہ مکدّر ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ طوفان آئیگا اور برف باری ہو گی۔ خودسر ربّانی نے باپ کا کہنا نہ مانا اور کہا۔ مَیں دُور نہیں جاؤں گا ابھی آجاتا ہوں۔ ربانی گھر سے تو اس ارادے سے نکلا تھا کہ تھوڑی سی دیر میں آجائیگا۔ مگر شکار کی تلاش میں بہت دُور نکل گیا۔ اور بے نیل مرام خالی ہاتھ لوٹا تو شام ہونے کو تھی۔ یکایک اُس کے دیکھتے دیکھتے اندھیرا ہو گیا اور برف زور زور سے گرنے لگی۔ اِس گھبراہٹ میں ربانی راستہ بھول گیا۔ اور پہاڑ کی گھاٹیوں میں ٹھوکریں کھانے لگا۔ ربانی کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس نے مدد کے لئے چیخیں ماریں۔ لوگوں کو پکارا۔ مگر وہاں کون تھا۔ کہ آتا اور اسے گھر لے جاتا سردی اور برف اور تند ہوا سے ربانی کی حالت دِگرگوں ہو گئی! اور نیم بیہوشی کی حالت میں برف پر گر پڑا۔ اِس وقت اُس کے کان میں کُتّے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو سُلطان کا کُتّا شیرا برف کو سُونگھتا ہوا اس کی طرف آرہا ہے۔ ربانی نے اپنی تمام رہی سہی طاقت استعمال کر کے کُتّے کو آواز دی۔ اور شیرا اِدھر لپکا۔ تھوڑی دیر

بعد سلطان بھی پوستین پہنے داہنے ہاتھ میں نیزہ اور بائیں میں کمبل لئے ہوئے نمودار ہوا۔ بھائی کو دیکھ کر ربانی جی اُٹھا ؛

(۱۱)

ربانی بھائی کے ساتھ ہولیا مگر سردی سے شل ہو رہا تھا۔ اور طاقت رفتار زائل ہوچکی تھی۔ مصیبت یہ ہوئی کہ برف نے راستہ کے نشان مٹادئے اور سلطان بھی راستہ بھول گیا۔ بڑی مشکل سے ربانی چند قدم چلا اور بولا "بھائی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی راستہ بھول گئے۔ اب ہمارا خدا حافظ ہے۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔ میرے پاؤں سوگئے۔ میں آگے نہیں چل سکتا۔ میری آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے سو لینے دو" یہ کہہ کر وہ برف پر لیٹ گیا۔ اور اُٹھنے سے انکار کردیا۔ سلطان نے اپنی پوستین اُتار کر اُسے پہنادی۔ نصف کمبل برف پر بچھا کر اُس پر ربانی کو جس پر غنودگی طاری تھی لٹادیا۔ اور نصف کمبل اس کے اوپر ڈال دیا۔ اور شیرا کو کہا "شیرا! شیرا! کیا دیکھ رہے ہو گھر جاؤ اور ہماری مدد کے لئے آدمی لاؤ" انسان کو اپنی عقل انسانی پر ناز ہے۔ مگر میں کہتا ہوں انسان سے حیوان کہیں زیادہ سمجھدار ہیں۔ شیرا نے مالک کا مطلب سمجھ لیا۔ اُس کے پاؤں چاٹے اور ایک طرف منہ کرکے وہاں سے دوڑ گیا

اور غائب ہو گیا +

(۱۲)

کئی گھنٹے گزر گئے۔ طوفان رک گیا۔ برف باری تھم گئی۔ بوڑھا میاں صمدو اور اس کے کارخانے کے ملازم مشعلیں لئے کھڑے ہیں۔ ایک ڈاکٹر بھی اُن کے ساتھ ہے۔ شیرا کتا سلطان کے پاؤں چاٹ رہا ہے۔ سلطان اور ربانی ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے ہیں۔ لوگ انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ربانی کا ہاتھ سلطان کے ہاتھ میں ہے۔ ربانی کا دل حرکت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ بچ جائیگا۔ اسے پوستین اور کمبل نے بچا لیا۔ مگر دوسرا جوان چونکہ برہنہ تھا۔ اب لاعلاج ہے۔ اُس کے دل کی حرکت بند ہو چکی ہے۔ اور اب وہ مردہ صد سالہ سے بدتر ہے +

پیمانۂ صبر

(۱)

سنت رام انجنیئر اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ سول سرجن تھا۔ جس نے اُسے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت بھیجا اور جب وہ وہاں سے ڈپلومے اور ڈگریاں لے کر واپس آیا تو اُس کی شادی ایک شریف زادی لاج ونتی سے کر دی جو شرم و حیا کی پُتلی دولتمند باپ کی آنکھوں کا نُور اور پاک دامن ماں کے دل کا سرور تھی۔ لاج ونتی اسم بامسمیٰ تھی۔ اِس میں وہ تمام خُوبیاں تھیں۔ جن کے لئے ہندوستان کی ستونتیاں مشہور ہیں۔ وہ خاوند کی فرمانبردار اور بہترین خانہ دار تھی۔ اس کی آنکھیں شوہر کی صُورت کے لئے اور کان آواز کے لئے وقف تھے۔ وہ غیر مرد کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا گناہ سمجھتی تھی۔ اس کا ایمان یہ تھا کہ میاں بیوی کے لئے

دو قالب اور ایک جان ہونا ضروری ہے ؛

(۲)

سنت رام کو خدا نے سب کچھ دیا تھا۔ اس کے پاس بے شمار دولت تھی۔ وہ ماہ لقا بیوی کا شوہر تھا۔ وہ تندرست تھا۔ غرض تمام نعمتیں جن کے لئے لوگ بیقرار رہتے ہیں اُسے میسّر تھیں۔ صرف ایک کسر تھی کہ وہ اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی صرف ایک بیٹی کوشلیا تھی۔ جس کے بعد اس کے ہاں اَور کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اِس لئے وُہ اسے آنکھ کا تارا سمجھتا تھا۔ اور کوشلیا اُسے ہزار بیٹوں سے بڑھ کر پیاری تھی۔ ہم حیران ہیں کہ لوگ جب اُن کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ تو خوشیاں کرتے ہیں۔ باجے بجواتے ہیں مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں۔ اور جب لڑکی پیدا ہو تو مغموم ملول اور اُداس ہو جاتے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ فی صدی نوّے فرزند بڑے ہو کر والدین کے تمام احسان فراموش اور تمام حقوق پامال کر دیتے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اکثر بیٹے عیّاش۔ شراب خوار۔ جعلساز۔ دغاباز۔ چور اور ڈاکو بن کر ننگ خاندان کہلاتے اور باپ دادا کی عزّت بگاڑ دیتے ہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ ناہموار فرزند بھیڑیوں سے بڑھ کر خطرناک واقعی مار آستین ثابت ہوتے ہیں۔ پھر بیٹے کی پیدائش پر بغلیں بجانا کیا معنے رکھتا ہے۔ اور

لڑکیوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کا دُنیائے فانی میں آنا ماں باپ کے لئے رنج والم کا باعث ہو جاتا ہے۔ لیکن حیران ہونے کی بات نہیں۔ لڑکیاں پرایا مال ہیں پال پوس کر انہیں غیر کے حوالے کر دینا پڑتا ہے۔ پھر ماں باپ کا کچھ زور نہیں رہتا۔ اگر خاوند اچھا نکلے تو والدین کا کلیجہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ اگر خاوند بُرا سلوک کرے۔ اِسے تنگی دے یا پیٹ کرے۔ جلائے۔ کھپائے۔ وہ زندہ رہ کر ہر روز ستی ہوا کریں تو ماں کو وہ دُکھ ہوتا ہے کہ خدا دُشمن کو نہ دکھائے۔ پھر خدانخواستہ اگر وہ بدراہ و گمراہ ہو جائیں یا دُختران گُناہ اور خواصان شیطان بن جائیں تو ماں باپ کو جینا وبال ہو جاتا ہے۔ اے خدا۔ لے خدا اولاد فتنۂ عظیم ہے۔ اگر بیٹا دے تو وہ سعادتمند ہو۔ اگر بیٹی آئے تو اس کی قسمت نیک ہو۔

(۳)

کوشلیا باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور وہ ماں باپ کو بہت پیاری تھی۔ بچپن میں والدین اُسے لاڈ پیار سے مردانے کپڑے پہناتے تھے۔ جب وہ سیانی ہوئی تو ایک منحوس گھڑی میں مسٹر سنت رام نے اپنی حور شمائل بیوی کی مرضی کے خلاف ایک ناعاقبت اندیش دوست کے مشورے سے اُسے انگلستان بھیج دیا۔ وہاں اسے ایک بورڈنگ

میں داخل کیا گیا۔ اور جب چار سال کے بعد اٹھارہ برس کی عمر میں
وہ وہاں سے تعلیم پُوری کر کے واپس آئی تو اس کی کایا پلٹ چکی تھی
وہ ہندوستانی شرم وحیا اور طرزِ بود و ماند فراموش کر کے بالائے طاق
رکھ چکی تھی۔ اسے پردہ وبال جان اور کوٹھی کے کمرے کُنجِ قفس تھے۔
وہ بلا تامل اور بے تکلّف باپ کے دوستوں سے مِلتی جُلتی تھی۔ اور
نہایت بے باکانہ گُفتگو کرتی تھی۔ اور اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی
جسے پُرانی تہذیب کے بزرگ سُن کر شل ہو جاتے تھے۔

(۴)

ان ایام میں مسٹر سنت رام راولپنڈی میں اگز کٹو انجنیئر تھا۔
اِس کی کوٹھی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب دتہ مل سول سرجن کی کوٹھی تھی۔
ڈاکٹر صاحب کا لڑکا سائیں دتہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اور نہایت
خُوش وضع جامہ زیب بانکا نوجوان تھا۔ چونکہ انجنیئر صاحب اور
سول سرجن میں بڑی دوستی اور آمد و رفت تھی قُدرتاً کوشلیا اور
سائیں دتہ میں میل جول ہو گیا۔ اور میل جول نے محبّت کی صُورت اختیار
کر لی لاج ونتی نے جب یہ گرم جوشی اور اختلاط دیکھا تو بہت سٹ پٹائی
بیٹی کو علیحدگی میں بہت سمجھایا۔ اُونچ نیچ نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔
مگر کوشلیا کے سر پر محبّت کا جنّ سوار تھا۔ ماں کی نصیحت نے جلتی

آگ پر تیل کا کام کیا۔ بہت بگڑی بہت جھلائی اور ماں کے گلے کا ہار ہو گئی۔ منہ لال چقندر ہو گیا۔ اور طیش میں آ کر بولی۔ اماں رہنے بھی دو۔ میں ایسی باتیں سننا نہیں چاہتی۔ سائیں دتہ میرا دوست ہے اور مجھے اس سے محبت۔ دوست کو چاہنا کوئی گناہ نہیں اور یہ کونسا قانون ہے کہ عورت مرد سے دوستی اور محبت نہ کرے۔ یہ گفتگو سن کر لاج ونتی کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ سن ہو گئی۔ اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ اور پھر بیٹی کو سمجھانے یا راہ راست پر لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ خرابی یہ ہوئی کہ جب بیوی نے خاوند سے شکوہ کیا تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ اور کہا۔ کہ فکر کا مقام نہیں۔ کوشلیا ایسی نہیں۔ وہ ولایت کی تعلیم یافتہ ہے۔ نیکی بدی خوب سمجھتی ہے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اور لڑکیاں بند ہوا بن کر رہنا نہیں چاہتیں اس کی عمر اٹھارہ سال سے اوپر ہے۔ اسے ہم قانوناً روک بھی نہیں سکتے۔ یہ سن کر لاج ونتی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور رنگ زرد ہو گیا۔

(۵)

آخر وہ وقت آ گیا کہ مسٹر سنت رام کے ایام ملازمت ۵۵ سالہ قاعدے کے رو سے ختم ہو گئے۔ اس کی پنشن ہو گئی اور وہ لاہور جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ لاہور میں اس نے مستقل قیام کے لئے ماڈل ٹاؤن

میں ایک عظیم الشان دو منزلہ کوٹھی تخمیناً ساٹھ ہزار کی لاگت سے اسی دن کے لئے بنوا رکھی تھی۔ جس کے ساتھ ایک دلکشا و روح افزا باغ تھا۔ کوٹھی کے پیل پائے سنگ مرمر کے اور فرش ملتانی ابری کا تھا۔ یہ کوٹھی تمام ماڈل ٹاؤن کی ناک تھی۔ جیسے مسٹر سنت رام کے کارنمے اب بجا رہے تھے۔ یہ کوشلیا کا راولپنڈی میں آخری دن تھا۔ وہ اور سائیں دتہ تنہا کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کوشلیا کا چہرہ ملول تھا! ور سائیں دتہ کا مغموم۔ کوشلیا کی خشک آنکھیں جو عموماً صحرائے عرب کو شرماتی تھیں اس وقت آبشار ہو رہی تھیں وہ رو رہی تھی۔ زار و قطار رو رہی تھی۔ اور سائیں دتہ اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ کہ دیکھو گھبراؤ نہیں میں تمہارا ہوں۔ فقط تمہارا ہوں۔ تمہارے سوائے کسی کا نہیں ہو سکتا میں نے والدہ سے ذکر کر دیا ہے۔ اُمید ہے وہ والد کو منا لیں گی۔ تم میرے والد کی طبیعت سے واقف نہیں۔ وہ بڑے زبردست اور جابر انسان ہیں اور میری شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں اگر میں نے سینہ سپر ہو کر ان کا مقابلہ کیا تو قیامت آ جائے گی۔ میں ابھی محتاج ہوں۔ وہ مجھے گھر سے نکالتے ہوئے ذرا بھی ہچکچائیں گے تم تسلی رکھو میں بہت جلد اطلاع دوں گا۔ اور لاہور پہنچ کر تم سے ملوں گا۔ ابھی دونوں راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے کہ کوٹھی کے پھاٹک پر

موٹر آ گئی - اور شوفر نے ہارن بجایا - اتنے میں انجنیئر نے آواز دی کہ کوشی پیاری کوشی کہاں ہو - ریل کا وقت ہو گیا یہ سُن کر کوشلیا کا کلیجہ شق ہو گیا - اس کے دِل میں درد اُٹھا اور وہ جبراً سائیں دتہ سے جُدا ہو کر موٹر میں جس میں اس کی والدہ اور والد بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے - سوار ہو گئی - شوفر نے ہارن دیا اور موٹر سٹیشن کی طرف روانہ ہوئی *

(۶)

راولپنڈی سے ماڈل ٹاؤن وارد ہوئے کوشلیا کو ایک ہفتہ ہو گیا - مگر سائیں دتہ کا کوئی خط نہ آیا - یہ دن اس نے بڑی تشویش اور اضطراب میں کاٹے - یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے فُرقت کا عذاب محسُوس کیا - ایک ہفتے میں اس کی حالت دگرگوں ہو گئی - بھُوک سُوکھ گئی - آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے اور گورا رنگ پیلا پڑ گیا - آٹھ دن انتظار کر کے اس نے خود پہل کی اور پہلے ایک خط لکھا پھر تار دیا - مگر کوئی جواب نہ آیا دو ہفتے گزر گئے اور کوئی خط نہ ملا - مہینہ گُزر گیا - کوشلیا کی بے قراری حد سے زیادہ ہو گئی - اور اس نے ایک خط رجسٹری کرا کے سائیں دتہ کو بھیجا - جس کی رسید تو تیسرے دن آ گئی - مگر جواب کوئی نہ آیا - اور وہ راولپنڈی کا بہانہ ڈھونڈنے

لگی اُس کی والدہ تو رضامند نہ ہوئی مگر انجنیئر صاحب راضی ہو گئے۔ یکایک ایک لفافہ جس پر سائیں دتہ کی تحریر تھی۔ اسے صبح کی ڈاک سے وصول ہُوا۔ اس نے بیتاب ہو کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ یہ خط ایک آسمانی گولہ تھا۔ جس نے تمام اُمیدوں کے دھوئیں اُڑا دیئے ؎

(۷)

خط میں لکھا تھا:۔

میرے دل کی مالک کوشی۔ مجھے بُھول جاؤ خُدا کے لئے بُھول جاؤ۔ مَیں تمہارے لائق نہیں۔ افسوس صد افسوس کشت اُمید پر بجلی گر گئی اور خانہ مسرّت تباہ ہو گیا۔ جب میرے والد کو معلوم ہُوا کہ تم میں اور مجھ میں محبّت کا قول و قرار ہو چکا ہے تو آگ بھبوکا ہو گئے۔ بادل کی طرح گرجے۔ بجلی کی طرح کڑکے اور مجھے ہزاروں بے نقط سُنائیں جس کا مجھے رنج نہیں لیکن رونا تو یہ ہے کہ آپ کی شان میں بھی ناواجب کلمات کہے اور جب میں نے ان کا جواب دیا تو کہا مَیں تجھے ایک ہفتے کی مُہلت دیتا ہوں۔ اگر اس دوران میں تُو نے میری مرضی کے مطابق اپنی منسوبہ سے شادی نہ کی تو تیری جگہ میرے گھر میں نہ ہو گی۔ پھر نہ تو میرا بیٹا نہ میں تیرا باپ مَیں تجھے عاق کر دوں گا۔ اور جائداد سے محروم جو کچھ

میرے پاس ہے۔ سماج کو دے دُونگا۔ ایسی عورت جو ہندوستان کے قدیم رواج کو ٹھکرا دے۔ جو علے الصباح اُٹھ کر اور نیم پرد کپڑے پہن کر تنہا ہوا خوری کو نکل جائے۔ جو مردوں میں بیٹھ کر اُن سے بے تکلّف ہنسی مذاق کرے۔ بزرگوں کی عزّت نہ کرے جس میں حیا اور شرم نہ ہو ہرگز ہرگز میری بہو نہیں ہوسکتی۔ میں نے چاہا کہ والد کی دھمکی کی پروانہ کروں۔ بے سروسامان تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ مگر غیرت نے اجازت نہ دی۔ کہاں تم امیرزادی اور کہاں میں باپ کا محتاج قلاش اور کنگال۔ خرابی یہ ہوئی کہ والدہ کے آنسوؤں نے مجھے بے تاب کر دیا۔ اور مبہوت ہو کر میں نے قسمت کی ناؤ کو مصیبت کے سمندر میں ڈال دیا۔ پندرہ دن ہوئے کہ میری شادی ہو گئی میری بیوی خوبصورت ہے مگر میں اسے چڑیل سمجھتا ہوں۔ وہ امیر باپ کی بیٹی ہے۔ مگر مجھے کیا۔ میرے تو ہوش و حواس بجا نہیں رہے۔ اب میں ایک مشین کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ نہ زندہ ہوں نہ مُردہ۔ آہ کیا تھا اور کیا ہو گیا"۔

(۸)

یہ خط پڑھ کر کوشلیا کے ہوش اُڑ گئے۔ دُنیا اِس کے لئے تاریک ہو گئی۔ مسرّت کا چراغ گل ہو گیا اور وہ کھسیانی ہو کر گھر والوں پر

برس بڑی ماں کو ناواجب کلمے کہے۔ باپ سے آمادہ جنگ ہوئی نوکروں کو صلواتیں سنائیں۔ اپنا قیمتی پیانو چکنا چور کر دیا۔ سنگار بکس آگ میں ڈال دیا۔ اور منہ ڈھانپ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ صبح کو خط آیا اور شام کو اسے بخار ہو گیا۔ جس نے سرسام کی شکل اختیار کر لی۔ ہذیان کے غلبہ میں وہ اپنے بال نوچتی چیخیں مارتی شور و غل کرتی۔ سائیں دتہ کو پکارتی اور اس کے والد کو برا بھلا کہتی تھی۔ وہ اکیس دن بیمار رہی اور اس وقت گھر والے اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس کی حالت نے پلٹا کھایا اور نا امیدی میں امید نے جھلک دکھائی اس کا بخار ہلکا ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ اتر گیا۔ اور اس نے صحت کی طرف قدم رکھا۔ اگر وہ اس وقت مر جاتی تو اچھا تھا۔ مگر تقدیر کی تحریر کو کون مٹا سکتا ہے۔ نئی روشنی کے پرستار نہ مانیں مگر ہم قسمت کے قائل ہیں۔

(۹)

کوشلیا چلنے پھرنے لگی اور اچھی ہو گئی اور بظاہر سائیں دتہ کو بھول گئی اس نے دوبارہ اپنی پہلی طرز زندگی اختیار کر لی۔ وہ پھر صبح کو تنہا یا کبھی کسی سہیلی کے ہمراہ سیر کو جانے لگی۔ ماڈل ٹاؤن کے جوان جن کو صبح کی ہوا خوری کی عادت ہے وہ بھی اکثر اس کی ہوا خوری میں

اس کے شریک ہو جاتے تھے۔ اور سیر کرتے ہوئے خُوب ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ اس کا والد دولت مند تھا اِس لئے اس کا دستر خوان وسیع تھا۔ اکثر پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں اور مہمان جب چائے کی محفل میں انگریزی اور دیسی مٹھائیاں چکھنے آتے تھے تو میزبانی کے فرائض کوشلیا ہی سر انجام دیتی تھی۔ اور اس خُوبی سے کہ کاردان ٹیلر بھی چکرا جاتے تھے ان پارٹیوں میں پُرانے فیشن کے بُڈھے بھی بُلائے جاتے تھے۔ اور وہ ایک ہندوستانی دوشیزہ لڑکی کو محفل میں مُنہ اُٹھائے اِدھر اُدھر پھرتے۔ اجنبیوں سے ہاتھ ملاتے اور قہقہے لگاتے دیکھ کر انگشت بہ دنداں ہوتے تھے۔ مگر موجودہ سوسائٹی میں اِن زائد المیعاد ہستیوں کی کون سُنتا تھا۔ دراصل انجنیئر صاحب کا ان پارٹیوں میں خاص مطلب تھا۔ وہ کوشلیا کے لئے بَر کی تلاش میں تھے۔ ہاں پارٹیاں آجکل واقعی نمائش کا بہترین طریقہ اور شکار پھانسنے کا ریشمی جال ہیں ÷

(۱۰)

کوشلیا تو اب سائیں دتہ سے مایُوس ہو چکی تھی۔ اِس لئے وہ ماں کی منت خوشامد اور باپ کی عاجزانہ تقریروں سے آخر پسیج گئی۔ ان پارٹیوں کے شریک ہونے والوں میں ایک نوجوان درباری لال

بھی تھا۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کا ایم۔اے تھا۔ اور قدرت نے اسے فیاضی سے مردانہ حسن عطا کیا تھا چونکہ صاحب جائیداد تھا۔ اس لئے ایم۔اے کی ڈگری لے کر وہ ملازمت کا تمنائی نہ تھا۔ وہ آج کل کے گریجوئیٹوں میں سے نہ تھا۔ جو ماں باپ کی تمام عمر کی کمائی ضائع کر کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے خواب دیکھتے ہیں۔ مگر جن کی امیدوں کے جہاز ہمیشہ مایوسیوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کاروبار کرتا تھا۔ اور اس میں لاکھوں کماتا تھا۔ کوشلیا کی شادی درباری لال سے ہو گئی۔ برات دھوم دھام سے آئی۔ جس کا بڑے تزک و احتشام سے استقبال ہوا۔ اور دلہن دولہا کی کوٹھی میں اُٹھ گئی +

(۱۱)

کوشلیا تعلیم یافتہ تھی۔ اگرچہ آزاد مزاج اور خود سر تھی۔ اور ہندوستان کی بیٹی ہو کر یورپ کی دوشیزہ کہلانا پسند کرتی تھی۔ مگر حسین اور مہ جبیں تھی۔ اس لئے درباری لال کو اس سے بے انتہا محبت تھی۔ لیکن کوشلیا کو خاوند سے بہت کم انس تھا۔ وہ خاوند کی برائے نام بیوی تھی۔ اس کا یہ خیال تھا۔ کہ عورت کے حسن و جمال کی دیوار کے لئے اولاد دیمک ہے۔ اس لئے اولاد سے سخت نفرت تھی۔ اور وہ تمام عمر بانجھ

رہنا چاہتی تھی۔ وہ خاوند کے گھر رہتی تھی۔ مگر ہر دوسرے دن ماں باپ کے گھر آتی تھی۔ پارٹیوں میں بن ٹھن کر شریک ہوتی تھی پارٹیاں دیتی تھی۔ ہفتہ میں پانچ چھ بار سینما دیکھتی تھی۔ اور اِس طرح اپنی زندگی کے ایّام بے فکری سے بسر کر رہی تھی۔ خاوند اس کا برتاؤ دیکھتا اور کُڑھتا تھا۔ مگر خاموش تھا۔ وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتا تھا ؎

کہنے دیتی نہیں کچھ مُنہ سے محبّت تیری
لب پہ رہ جاتی ہے آآ کے شکایت تیری

وہ بیوی کی بے اعتنائی اور سرد مہری بڑے صبر سے برداشت کر رہا تھا۔ مگر ایک بات اُسے سخت ناگوار تھی اور وہ یہ تھی۔ کہ وہ دیکھ نہ سکتا تھا کہ اُس کی بیوی یورپین سوسائٹی کی تقلید میں اس کے دوستوں سے ہنسی مذاق کرے۔ اور اُن کے ساتھ بے تکلف ہو کر سیر یا خرید و فروخت کے لئے جائے ؛

(۱۲)

کوشلیا کی شادی ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ کہ اسے ایک خط باپ کے پتہ سے آیا۔ یہ سائیں دتہ کا خط تھا۔ پڑھ کر اس کا کلیجہ بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اس کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ اور وہ چنگاری جو چندروز کے لئے خاکستر میں دب گئی تھی۔ پھر چمک اُٹھی۔ مضمون

خط ملاحظہ ہو:-

"میری جانِ جاں کوشی۔ مبارک ہو۔ میری بیڑیاں کٹ گئیں اور میں آزاد ہو گیا والد صاحب پرسوں موٹر پر سوار ہو کر ایک مریض کو دیکھنے جا رہے تھے۔ کہ لاری سے ٹکر ہو گئی۔ شوفر زخمی ہوا اور وہ اِس جہان سے رُخصت ہو گئے۔ چلو پاپ کٹا۔ جس شخص نے میری عمر تباہ کر دی وہ میرا باپ نہ تھا۔ اب میں باپ کی جائیداد کا واحد مالک اور مرضی کا مختار ہوں۔ وہ عورت جسے بیوی کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے مجھے پسند نہیں۔ دل ایک ہوتا ہے۔ وہ تمہارے پاس ہے۔ اِس عورت کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک خادمہ کی ہے۔ وہ محبت جتاتی ہے۔ خدمت کرتی ہے۔ صدقے اور قُربان ہوتی ہے۔ مگر مجھے اچھی نہیں لگتی۔ کاش تم جلدی نہ کرتیں۔ خیر اب بھی کچھ نہیں گیا۔ شادی رُک گئی مگر محبت کو پہاڑ بھی نہیں روک سکتے۔ آج سے دسویں دن آؤں گا۔ اور تمہیں دیکھ کر پھر جی جاؤں گا"۔

(۱۳)

شام کو جو دربار ی لال اپنی مل سے واپس آیا تو اُس کی حیرت کی

انتہا نہ رہی۔ کوشلیا اس سے سیدھے مُنہ بات نہ کرتی تھی۔ اگر مطلب ہو تو بولتی تھی ورنہ خاموش رہتی تھی۔ خاوند گرمجوشی ڈھونڈتا تھا اور بیوی برف کی سِل تھی۔ بیوی نے کبھی خاوند کا انتظار نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اس کے گھر آنے سے پہلے ہی سَیر کو یا سنیما چلی جاتی تھی۔ اور بڑی دیر سے گھر آتی تھی۔ کبھی کبھی تو کئی کئی دن ورانے دکھائی تک نہ دیتی تھی۔ آج وہ اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ بڑے تپاک سے ملی۔ اور بغلگیر ہو کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی ؛

کوشلیا۔ "پیارے میرا ایک دوست راولپنڈی سے آنے والا ہے۔ مجھے اُمید ہے تُم اس کی خُوب خاطر تواضع کرو گے۔ وہ ہمارے ہاں ٹھیرے گا۔ اور چند دن مہمان رہے گا"!

دربارہی۔ میری جان تم کیا کہہ رہی ہو۔ تُم شادی شُدہ عورت ہو۔ یہ کون ہے جسے تُم دوست کہہ رہی ہو۔ ہماری سوسائٹی میں دوست کا لفظ عورت کسی مرد کے لئے استعمال نہیں کر سکتی اس سے بُرے معنے لئے جاتے ہیں۔ عورتوں کی محبّت عورتوں سے ہو تو انہیں سہیلیاں کہا جاتا ہے غیر مرد کو کوئی بیاہی ہوئی عورت آداب محفل کے لحاظ سے اگر دوست کہے تو عیب کی بات ہے ؛

کوشلیا۔ (تنگ کر) واہ جی واہ۔ تمہارے خیال دقیانوسی ہیں۔ کیوں

مرد عورت کا دوست کیوں نہ ہو؟ دل صاف اور محبت پاک ہونی چاہیئے"۔

درباری۔ کیسی بچّوں کی طرح باتیں کرتی ہو۔ گھی اور آگ اگر یکجا ہوں تو گھی ضرور پگھل جاتا ہے۔ مَیں تمہارے خیالات کو درست تسلیم نہیں کر سکتا۔

کوشلیا۔ تمہاری مرضی مگر مَیں اپنی آزادی شادی پر قربان نہیں کر سکتی۔ سائیں دتہ میرا مدّت کا دوست ہے وہ آئیگا اور ضرور آئیگا! اور جس مکان میں مَیں رہتی ہوں وہاں ٹھہرے گا۔ اگر تم اعتراض کروگے تو مَیں باپ کے ہاں چلی جاؤں گی اور اُسے وہاں ٹھہراؤں گی"۔

یہ سُن کر درباری کا رنگ پہلے سُرخ اور پھر زرد ہو گیا۔

(۱۴)

سائیں دتہ حسب وعدہ آیا اور درباری لال کی کوٹھی میں اُتارا گیا۔ بندۂ محبّت۔ درباری نے اپنی محبُوبہ کی خاطر اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اس کے آتے ہی کوشلیا کچھ کی کچھ ہو گئی۔ وہی بیوی جو خاوند کی صُورت سے بیزار تھی۔ مہمان کے آتے ہی ہنس مُکھ ہو گئی۔ اور اب خاوند کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل نہ پڑتے تھے۔ چند دن تو اچھّی طرح گزُر گئے۔ مگر پھر رنگ اور ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کوشلیا اور اس کے

دوست کا خلوت خانہ بن گیا۔ خاوند علیحدہ کمرے میں پھینکا گیا۔ اور کوشلیا اور مہمان کا پلنگ ایک کمرے میں بچھنے لگا۔ گو رفع خجالت کے لئے اسی کمرے میں ایک خادمہ بھی سویا کرتی تھی۔ وہی کوشلیا جسے خاوند کے آرام و آسائش کا بالکل خیال نہ تھا۔ اسے نوکروں پر چھوڑ رکھا تھا۔ کہ جیسا چاہیں کھانا دیں یا نہ دیں۔ جس کی پوشاک کو اس نے کبھی آنکھ بھر کے نہ دیکھا تھا۔ کہ آیا مرمت طلب ہے یا نہیں۔ جسے اُداس دیکھ کر اس کی دلجوئی اس کے لئے کسر شان تھی۔ اور بیماری میں دُور دُور رہتی تھی۔ اب مہمان کی باندی بنی ہوئی تھی اور اس پر جان چھڑکتی تھی۔ اس کی خوراک کا اہتمام خود کرتی۔ اور اسے اپنے ہاتھ سے شراب پلاتی تھی۔ خاوند کے ساتھ کبھی بھولے سے بھی نہ گئی۔ اور اب ہر رات اُسے لے کر دُوسرے شو میں سنیما دیکھنے جاتی اور آدھی رات کو واپس آتی تھی سائیں دتہ آیا تو چند دن کے لئے تھا۔ لیکن چھ مہینے گزر چکے تھے۔ اور وہ جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ بے حیا۔ احسان فراموش بیوی خاوند کی نرمی اور کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہی اور اسے بے دریغ جلا رہی تھی۔ اس کی گاڑھے پسینہ کی کمائی کوڑیوں کی طرح لٹاتی تھی۔ اس کی بدولت اسے بادشاہت نصیب تھی۔ مگر بے عزت کو یہ خیال نہ آتا تھا۔ کہ کم سے کم اُس کا دل تو نہ دُکھاؤں اور اپنے محسن کو بُرا تو نہ سمجھوں ❊

(۱۵)

جب چھ ماہ گزر گئے تو مہمان کوشلیا سے رخصت لے کر راولپنڈی گیا۔ اس کے جاتے ہی کوشلیا پھر وہی سنگدل اور سرکہ جبیں عورت بن گئی۔ اس کی عارضی خوشی مزاجی یک قلم جاتی رہی۔ اور پھر خاوند اُسے دیو یا عفریت نظر آنے لگا۔ گویا اس جُدائی کا ذمہ دار وہی ہے۔ بھلا کوشلیا اب سائیں دتہ کے بغیر کب رہ سکتی تھی۔ خدا جانے دس دن اُس نے کیونکر کاٹے کہ پھر ضروری تار دے کر اسے بُلا لیا۔ وہ قضا کی طرح آدھمکا! اور وہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اگر درباری کو اپنی بیوی سے محبت نہ ہوتی تو وہ بھی پروا نہ کرتا اور فوراً کنارہ کش ہو جاتا۔ لیکن محبت اُسے چین نہ لینے دیتی تھی۔ اور وہ شمع کی طرح جل اور موم کی طرح پگھل رہا تھا۔ آخر اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور ایک رات وہ بھی چھپ کر سینما پہنچا وہاں جا کر اس نے دیکھا۔ کہ اس کی بیوی سائیں دتہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھی ہے۔ اور دونوں سگرٹ پی رہے ہیں وہ جل بھن کر کوئلہ ہو گیا۔ اور بکتا جھکتا گھر آیا۔ بارہ بجے کے بعد جب اسکی بیوی کی موٹر آئی۔ اور دونوں اُتر کر سونے کے کمرے میں گئے۔ تو وہ بھی وہاں پہنچا۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ دونوں ایک ہی پلنگ پر بیٹھے ہیں۔ اور خادمہ جو اس کمرے میں سویا کرتی تھی پڑی خراٹے لے رہی ہے +

(۱۶)

یہ حال دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ دیوانہ ہو گیا۔ عقل اور

ہوش نے جواب دے دیا۔ اُس نے کوشلیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ؞

درباری۔ اس بدمعاش کو جو میرے مکان میں میری چھاتی پر مونگ دلتا ہے کہہ دو کہ اسی وقت یہاں سے دُور ہو جائے ؞

کوشلیا۔ چھوڑ میرا ہاتھ۔ تُو آدمی ہے کہ حیوان یہ میرا معزز مہمان ہے یہ اس وقت یہاں سے نہیں جا سکتا؛؛

درباری۔ نہیں اسے جانا پڑے گا۔ اب یہاں اس کے لئے ایک لمحہ کو بھی جگہ نہیں ؞

کوشلیا۔ یہ بات ہے تو مَیں بھی اس کے ساتھ جاتی ہوں ؞

درباری۔ مَیں کہتا ہوں سمجھ جا ؞

کوشلیا۔ ہٹ پرے ہو ؞

درباری کو طیش آ گیا۔ حالت غیظ و غضب میں دیوانہ وار اس نے کوشلیا کی کلائی تو چھوڑ دی۔ لیکن اس کے دونوں ہاتھ زنبور بن کر اس کی گردن میں پیچی ہو گئے درباری توانا اور طاقتور جوان تھا۔ اور اس وقت دیو انتقام بنا ہُوا تھا۔ اس آہنی گرفت سے کوشلیا کا دم بند اور گلنار چہرہ نیلا ہو گیا۔ زبان مُنہ سے باہر آ کر موٹی ہو گئی۔ اور آنکھیں خوبصورت آنکھیں پتھرا کر باہر نکل آئیں۔ وہ تڑپی پھڑکی اور بے جان ہو کر سرد ہو گئی۔ کوشلیا کا کام تمام کر کے وہ سائیں دتہ کی طرف لوٹا مگر وہ غائب تھا ؞

دُودھ بھائی

(۱)

شیخ رحیم بخش اور شیخ کریم بخش حقیقی بھائی تھے۔ رحیم بخش بڑا تھا اور کریم بخش چھوٹا۔ دونوں سوداگر تھے۔ باپ کے مرنے پر دونوں نے جائداد تقسیم کرلی۔ اور علیحدہ علیحدہ رہنے لگے سنبلہ بڑے بھائی کی اکلوتی بیٹی اور مُشتاق چھوٹے بھائی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سنبلہ چندے آفتاب۔ چندے ماہتاب تھی۔ تو مُشتاق بدشکل۔ کالا کلوٹا بینگن لوٹا۔ سنبلہ کی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں میں خاص جادو تھا۔ اور مُشتاق کی آنکھیں ازرق تھیں اور یہ بات عجیب تھی۔ کالوں کی آنکھیں ازرق نہیں ہُوا کرتیں۔ سنبلہ کے سُرخ سُرخ ہونٹ لعلِ رماں کو شرماتے تھے۔ اور مُشتاق سطبر لب تھا۔

رحیم بخش اور کریم بخش نہ صرف حقیقی بھائی بلکہ ہم زُلف بھی تھے اور

یہی وجہ تھی کہ سنبلہ کی منگنی اس کے چچیرے بھائی اور خالہ کے بیٹے مشتاق سے ہو گئی۔ اس نسبت کے بعد جب سنبلہ چودہ سال کی تھی۔ اُس کی ماں کو پیغام اجل آگیا۔ اور ابھی اسے اس جہان فانی سے رخصت ہوئے ایک برس بھی نہ ہُوا تھا۔ کہ اس کی بہن مشتاق کی والدہ بھی چل بسی۔ مشتاق کا چال چلن مشتبہ تھا۔ اور سنبلہ جنت کی حُور تھی۔ وہ کسی طرح ایسی خورشید لقا نازنین کے قابل نہ تھا۔ رحیم بخش کے دوستوں نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھو آنکھوں سے دیکھ کر مکھی نہیں نگلی جاتی۔ بیٹی کو جان بوجھ کر اندھے کنوئیں میں نہ دھکیلو۔ مگر شیخ صاحب کو اپنی مرحومہ بیوی سے بڑی اُلفت تھی۔ انہیں گوارا نہ ہُوا کہ ان کی بیوی کا وعدہ ایفا نہ ہو۔ اِس لئے جب سنبلہ اٹھارہ اور مشتاق اکیس سال کا ہُوا۔ تو ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ جو کوئی دولہا دُلہن کو دیکھتا بے ساختہ یہی کہتا کہ چاند کو گہن لگ گیا ہے ؛

(۲)

سنبلہ نے اپنی ماں کا دُودھ نہیں پیا تھا۔ وہ پیٹ ہی میں تھی کہ اس کی ماں بیمار ہو گئی اور بیماری کے دوران میں جب وہ پیدا ہوئی۔ تو ڈاکٹروں کے حکم سے سنبلہ کے لئے انّا بلوائی گئی۔ یہ انّا جس کی گود میں اُس وقت لڑکا تھا۔ قوم کی راجپوتنی تھی۔ جس نے اچھا وقت دیکھا تھا

جب گردش زمانہ سے خاوند کے مرنے پر محتاج ہو گئی۔ تو شیخ صاحب نے جو اس کے حال سے واقف تھے۔ اس کی دستگیری کر کے اسے سنبلہ کی انّا مقرر کر دیا۔ اور ہمیشہ اس کی اور اس کے بیٹے یعنی سنبلہ کے دودھ بھائی نُور جمال کی بہت عزّت کیا کرتے اور کہا کرتے کہ یہ وہی نیک بخت ہے۔ جس کا خاوند دو سو روپیہ ماہوار کماتا تھا۔ جس کا اپنا مکان تھا۔ اور جس کے دروازے پر ایک بھینس یا گائے ہمیشہ بندھی رہتی تھی۔ مگر فضول خرچ خاوند کی ناعاقبت اندیشی سے اب انّا بن کر اپنا اور اپنے بچّے کا پیٹ پالتی ہے۔ اس زندگی کے بیابان میں انسان کو ہمیشہ آندھیوں اور طوفانوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ غرض جب تک نُور جمال اور اس کی والدہ شیخ صاحب کے ہاں رہے امیرانہ زندگی بسر کرتے رہے اور جب سنبلہ کا دودھ چھڑایا گیا تو انہوں نے نُور جمال کو مدرسے میں داخل کر دیا۔ اُسے پڑھایا لکھایا۔ اور جوان ہونے پر اس کے لئے چھوٹے پیمانے پر ایک سوداگری کی دکان کھول دی۔ جو بہت جلد چمک گئی۔ نُور جمال چونکہ سنبلہ کا دودھ بھائی تھا۔ وہ اس سے پردہ نہ کرتی تھی اور دونوں میں حد سے زیادہ محبت تھی۔ یہ سعادت مند جوان اُسے ماں جائی سمجھتا تھا۔ شادی کی رسوم میں نُور جمال ہی منتظم تھا۔ حقیقی بھائی کی طرح سنبلہ کی

پالکی کو اس نے کندھا دیا۔ اُس کی ہمشیرہ اسی کا دیا ہُوا بیش بہا کمخاب کا جوڑا اور جڑاؤ چندن ہار پہن کر رخصت ہوئی +

(۳)

اگرچہ مشتاق اور سنبلہ کا ملاپ ایک طرح زحل اور زہرہ کا قران تھا۔ بیوی کہکشاں تھی تو خاوند ظُلمات کا سایہ۔ مگر سنبلہ کے جسم نازک میں پدمنی کی رُوح تھی۔ وہ ہندوستان کی ستونتی تھی۔ وہ پاک دامنی کو اپنا زیور اور شوہر کو اپنا سر تاج۔ دل و جان کا واحد مالک اور مجازی خدا سمجھتی تھی۔ خاوند سے اسے محبّت۔ بڑی محبّت تھی۔ یہاں تک کہ اسے دیکھ کر جیتی تھی۔ مگر اس کی سہیلیاں حیران ہوتیں اور ہنسا کرتی تھیں۔ کہ فاختہ اور زاغ کا جوڑا کبھی نہ دیکھا تھا۔ شادی کے بعد مشتاق نے بھی بظاہر اپنی عادتیں بدل ڈالی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سُدھر گیا ہے۔ واقعی وہ اس وقت پری پیکر بیوی کی شمع حُسن کا پروانہ معلوم ہوتا تھا۔ اور سنبلہ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتی تھی۔ مگر اُسے یہ خبر نہ تھی کہ برسات میں بادلوں کے تھوڑی دیر کے لئے چھٹ جانے سے دھوپ نے جھلک کھائی ہے۔ اور دن ہمیشہ یکساں نہیں رہتے +

ابھی شادی کو دو سال بھی نہ ہوئے تھے۔ کہ یکایک لاہور میں

طاعون نمودار ہُوا۔ پہلے تو خال خال وارداتیں ہونے لگیں۔ لیکن پھر اس کا اتنا زور ہُوا کہ لوگ توبہ توبہ پکار اُٹھے۔ مَوت کا بازار گرم ہوگیا۔ سُہاگنیں بیوہ ہوگئیں اور بچّے یتیم۔ کئی گھر بے چراغ ہوگئے۔ بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔ اور اس مرگ انبوہ میں سنبلہ کا باپ اور خُسر اور اس کی پیاری انّا اِس نامُراد و منحوس وبا کا شکار ہوگئے۔ اور سنبلہ کا چراغ مسرّت گُل ہو گیا +

(۴)

سنبلہ کا چراغ مسرّت گُل اِس طرح ہُوا۔ کہ شفیق باپ اور مہربان چچا کی وفات کا زخم ابھی ہرا تھا کہ مشتاق نے پیٹ سے باہر پاؤں نکالے اور زخم دامن دار کو ایسا چرکا دیا کہ وہ خُون رونے لگا۔ سنبلہ کا شک یقین کے درجے پر پہنچ گیا۔ کبھی کبھی اُسے شک ہوتا تھا۔ کہ اس کا خاوند بے وفائی کر رہا ہے۔ مگر جب یہ خیال آتا تھا تو اپنے آپ کو ملامت کرتی تھی۔ کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اب جو باپ اور خُسر نہ رہے تو وہ کھل کھیلا۔ پہلے تو خفیہ طور پر فیروزہ رقاصہ سے اس کا میل جول تھا۔ اب علانیہ تعلق ہوگیا۔ اور تعلق بھی ایسا کہ حُور شمائل بیوی اور اس کا خوبصورت بچہ نسیم یک قلم بُھول گئے۔ اب اس کا یہ حال تھا کہ سرشار و بدمست ہوکر کئی کئی دن رقاصہ کے ہاں پڑا رہتا تھا۔ سنبلہ ماہی بے آب

کی طرح تڑپتی تھی - اس کی صورت کو ترستی تھی اور وہ بے پروا تھا - مردو! بے رحم مردو! تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک پاک دامن عورت کے لئے جو اپنے ناتھ کی دیوانی اور پران پتی کی شیدا ہے خاوند کی بے وفائی اور بے اعتنائی کیسا عذاب ہے - یقین جانو کہ اس عذاب کے آگے قید تنہائی کی تکلیف - قبر کے کونے کی مصیبت اور دوزخ کا عذاب کوئی شے نہیں - بے پروا مرد گلچھرّے اُڑاتے ہیں - لیکن عورت رات کو کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدلتی - اور دن کو انگاروں پر لوٹتی ہے - اسے بھوک نہیں لگتی - نیند نہیں آتی - اس کا چراغ مسرت گُل - دُنیا تاریک اور نازک دل چکنا چُور ہو جاتا ہے - وہ تڑپتی ہے - پھڑکتی ہے - اور تمہیں رحم کے بجائے غصّہ آجاتا ہے - یہی حال شہید محبت اور قتیل ستم سنبلہ کا تھا - وہ مضطرب تھی - بے قرار تھی - مغموم تھی - ملول تھی - اور رُوسیاہ مشتاق اس کی تکلیف پر ہنستا تھا - ایک تو کریلا خود ہی کڑوا - دُوسرا نیم چڑھا ایک تو وہ خود ہی بے رحم تھا - دوسرے فیروزہ کی انگیخت جلتی آگ پر تیل ڈالتی تھی - غرض سنبلہ شمع کی طرح پگھل رہی تھی اور اس وقت سوا اس کے دودھ بھائی نورجمال کے اور کوئی نہ تھا - کہ اسے تسلّی دیتا - اس سے اپنی ہمشیرہ کی مصیبت دیکھی نہ جاتی تھی - اور ناچار زہر کے گھونٹ پی رہا تھا ؞

(۵)

مشتاق کا کوڑمغز۔ بدنیت اور دولت شرابی مشتاق کا یہ خیال تھا۔ کہ فیروزہ اس پر فریفتہ بلکہ اس کی عاشق زار ہے۔ اُسے اتنی سمجھ نہ تھی۔ کہ دُختران گُناہ اور خواصان شیطان صرف زر کی کنیزیں ہیں۔ اور زر ہی اُن کا خدا ہے۔ فیروزہ نے اسے وہ سبز دکھائے اور اسے ایسے بھرتے دیئے کہ اس کی عقل کی آنکھیں اندھی ہوگئیں۔ باپ کی جو کمائی تھی وہ ساری برباد کردی۔ اس کا بہت سا حصّہ فیروزہ کے خزانے میں داخل ہُوا۔ اور جو باقی رہا وہ شراب خواری کی نذر ہُوا۔ اپنی جائداد تلف کرنے کے بعد اس نے سنبلہ کے ورثے پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ اور سنبلہ نے بھی جو اس کی محبّت میں مسحُور تھی۔ اُسے خوش رکھنے کو کبھی اعتراض یا عُذر نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کی جائداد بھی تباہ ہوگئی اور گھر میں جھاڑو پھر گئی۔ نوکر نوکرانیاں بھی تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے ایک ایک کرکے چلتے بنے۔ اِس آڑے وقت میں اگر نور جمال ان کے کام نہ آتا۔ تو شاید وہ نان شبینہ کو محتاج ہو جاتے ؛

جب فیروزہ نے دیکھا۔ کہ اب مُرغی سونے کا انڈا نہیں دیتی۔ تو مشتاق کو ذلیل کرکے گھر سے نکال دیا۔ اور ایک نئے نواب کو جس کا نام محمدالدین تھا اپنا بنا لیا۔ اس تکلیف اور ناداری کے زمانے میں نور جمال

ان کی تمام ضروریات کا کفیل تھا۔ وہ دو وقت بہن کی خبر گیری کو آتا بچے کے لئے کھلونے اور مٹھائی لاتا۔ اور ہر طرح کی امداد کرتا تھا ‡

(۶)

ایک دن جو نورجمال حسب معمول آیا تو سنبلہ رو رہی تھی۔ اور نسیم سہما ہوا ماں کا مُنہ اِس طرح دیکھ رہا تھا کہ گویا وہ بھی رونے کو ہے۔ نُورجمال نے رونے کا باعث دریافت کیا تو سنبلہ نے سسکیاں لے کر کہا۔ بھائی میرے نسیم کے ابا کو دیوانی کے پیادے گرفتار کر کے لے گئے۔ انہیں کسی ساہوکار کا قرضہ دینا ہے۔ ڈگری ہو چکی تھی۔ گرفتاری کا وارنٹ نکلا ہُوا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ بیلف کہتا تھا۔ کہ دو ہزار روپے ادا کرنے پر رہائی ہو سکتی ہے۔ بھلا یہ رقم کہاں سے آئے۔ گھر میں تو اس وقت دو روپے بھی نہیں۔ ہائے اللہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ نُورجمال نے سنبلہ کی تشفی کی اور کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ خدا مشکل آسان کرے گا۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ خدا نے چاہا تو نسیم کا ابا شام سے پہلے گھر آ جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ سیدھا امپیریل بنک گیا۔ وہاں سے دو ہزار روپے نکلوائے۔ اور عدالت میں داخل کئے۔ اور جب شام کو اپنے دستور کے مطابق بہن اور بھانجے کی خبر گیری کو آیا تو مشتاق جیسا خود مطلب اور احسان فراموش بھی شاید ہی کوئی ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ نُورجمال کا جو اس کا محسن

اور اس کی بیوی اور بچے کا ان داتا تھا۔ شکریہ ادا کرتا۔ اسے اچھا نہ سمجھتا تھا۔ اور اس کا وہاں آنا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ جب سنبلہ نے رو رو کر دودھ بھائی کا شکریہ ادا کیا۔ تو وہ طنزاً مسکرا دیا۔ سچ ہے اندھے کے لئے دنیا اندھی ہے ٭

(۷)

خدا ہمیشہ نیت کا پھل دیتا ہے۔ نور جمال نیک بخت اور نیک نیت انسان تھا۔ شیخ رحیم بخش کے ایک ہزار روپے سے اس نے بساطی کی جو دکان کھولی تھی۔ اس میں اس کی دیانت داری۔ اور محنت سے اس قدر برکت ہوئی کہ اس وقت اس کا پچاس ہزار روپیہ بنک میں جمع تھا۔ اسے تجارت بیوپار کا خاص ملکہ تھا۔ وہ مٹی کو ہاتھ لگاتا تھا اور وہ سونا ہو جاتی تھی۔ اس کی بساطی کی دکان اب ایک مشہور ایجنسی تھی۔ جس میں ہزاروں کا لین دین ہوتا تھا۔ اب نور جمال بہت کم ہمشیرہ کے ہاں جاتا تھا۔ اس کے لئے مشتاق کی جلی کٹی باتیں ناقابل برداشت تھیں۔ ہاں نسیم کو ہر روز آدمی بھیج کر بلواتا اور کئی گھنٹے اپنے پاس رکھتا تھا۔ بلکہ لوگوں میں یہ مشہور تھا۔ کہ اسے دودھ بہن اور بھانجے سے اس قدر محبت ہے کہ شادی نہیں کرتا ٭

(۸)

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ نُورجمال کی طبیعت سرِشام سے پریشان تھی۔ جب وُہ رات کے دس بجے پلنگ پر لیٹا تو نیند نہ آئی۔ اور جب کروٹیں بدلتے ہوئے قلعہ کے گھڑیال نے بارہ بجائے تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ حیران ہُوا کہ اس وقت کون آیا ہے۔ جب دربان نے دروازہ کھولا تو ایک بُرقع پوش اس کی خواب گاہ میں آئی۔ نُورجمال نے دیکھا۔ کہ وُہ سنبلہ ہے۔ نسیم اس کی گود میں ہے۔ اس کا رنگ ہلدی کا گابھا ہو رہا ہے۔ بال پریشان اور آنکھوں کے گرد حلقے نمودار ہیں۔ سنبلہ نے اپنا سر نُورجمال کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور زار و قطار رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر نسیم بھی بسورنے لگا۔ سنبلہ کو اس حال میں دیکھ کر نُورجمال کا کلیجہ بلّیوں اُچھلنے لگا وہ گھبرا گیا۔ اور کہا۔ آپا خیر تو ہے اس وقت تُم کہاں؟ اگرچہ سنبلہ اس سے کچھ چھوٹی تھی۔ مگر وہ ابتدا سے اسے آپا کہا کرتا تھا۔ سنبلہ نے باچشم اشک بار کہا۔ کہ بھائی میں صدقے۔ نسیم کے ابّا کو بچاؤ۔ تمہارے سوا انہیں کوئی نہیں بچا سکتا انہوں نے جوشِ رقابت میں فیروزہ کے آشنا کو جس کے لئے وہ نکالے گئے ہیں ہے قتل کر دیا ہے۔ اور اب کوئی دم میں پولیس انہیں گرفتار کر لے گی۔ میرے اچھے بھائی اگر وہ نہ رہے تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر مجھ سے کچھ محبّت ہے۔ تو جس طرح بھی ہو

انہیں بچالو۔ نسیم کے ابّا کو بچالو۔ اسے یتیم نہ ہونے دو۔ یہ سُن کر نُور جمال سوچ میں پڑ گیا اور کچھ دیر کے بعد بولا۔ آپا کیا کہا تم نے۔ ہاں یہ کہا ہے۔ کہ جس طرح بھی ہو۔ اسے بچالو۔ بہت اچھا۔ پیاری آپا جان۔ میں اسے بچالوں گا۔ لو اب گھر جاؤ۔ تمہارا اس وقت یہاں رہنا میری اور تمہاری بدنامی کا باعث ہوگا۔ لو جاؤ خدا حافظ۔ مگر ٹھہرو۔ یہ کہہ کر اُس نے نسیم کو سنبلہ کی گود سے لے لیا اور بڑی دیر تک پیار کرتا رہا۔

(۹)

شہیدانِ وفا کی فہرست میں نُور جمال کا نام۔ سنبلہ کے دودھ بھائی کا نام خُون اور آنسوؤں سے لکھا گیا۔ اس نے پولیس میں جا کر بیان دیا۔ کہ میں نے محمد دین کو قتل کیا ہے۔" پھر مجسٹریٹ کے روبرو بھی رضا و رغبت سے اقبال کر لیا۔ اِس اقبال کی روشنی میں پولیس کے لئے "وجہ ٹکرآنی کی شہادت بہم پہنچانا کچھ مشکل نہ تھا۔ پیش قبض آلۂ قتل۔ خُون آلودہ لباس جس پر دودھ سے پرورش یافتہ جان دار کا لہو تھا۔ اور چشم دید گواہ پیش ہو گئے مدعائے جرم بھی گھڑ لیا گیا۔ اور پھانسی کے تختہ سے دُودھ بھائی۔ صادق القول دُودھ بھائی وفادار اور جاں نثار دُودھ بھائی سیدھا داخلِ فردوس ہُوا۔ اس کا مزار شاہ ابوالمعالی کے احاطے میں ہے۔ جس پر ہر جمعرات کو سنبلہ اور نسیم پھول چڑھاتے ہیں۔

خُلد آشیاں دُودھ بھائی کی جائداد اور بنک کے روپے کی آمدنی بروئے وصیّت. جو گرفتاری سے پہلے اُس نے لکھ دی تھی۔ اس کی آپا اور بھانجے کو ملتی ہے۔ اور ملتی رہے گی۔ جب نسیم بالغ ہو گا۔ تو اُسے قبضہ ملیگا۔ سنبلہ کا سیاہ رُو اور سیاہ دِل خاوند زندہ ہے۔ اور بیوی کے ٹکڑوں پر پڑا ہے۔ مگر اس کی زندگی قابل صد نفرین ہے ؎

بری کا تحفہ

(۱)

لوگ حیران تھے۔ کہ امتیاز جوان ہے امیر ہے اور پھر شادی کا نام نہیں لیتا۔ وہ پوچھتے تھے کہ کیا اس نے قسم کھائی ہے۔ کہ کسی سے شادی نہ کرونگا۔ واقعی اس نے قسم کھائی تھی۔ اور مدت تک وہ اپنی قسم پر قائم رہا۔ یکایک جب لوگوں کو یقین ہو چکا تھا۔ کہ اب وہ ساری عمر مجرد رہے گا۔ اس نے اپنی قسم شرابی کی توبہ کی طرح توڑ دی اور یہ شعر پڑھا ؏

ابر آیا ابھی تھوڑا سا ابھی ٹوٹ گئی!

میری توبہ ہے یہ زاہد ترا اقرار نہیں

یہ اس طرح ہوا کہ ایک دن وہ دریا کے کنارے سیلاب کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک موٹر آئی اور اس میں سے دو برقعے پوش عورتیں برآمد ہوئیں۔ دونوں کے برقعے ترکی وضع اور بنفشئی رنگ کے تھے۔ آپ کو معلوم

ہوگا۔ کہ جب دریا میں سیلاب آتا ہے۔ تو زن و مرد ضرور اسے دیکھنے آتے ہیں۔ خدا جانے غضبناک دریا کے شور اور اس کی تند موجوں کے زور میں انہیں کیا مزہ آتا ہے۔ یہ عورتیں جو لباس سے کسی اونچے گھرانے کی معلوم ہوتی تھیں اسی مطلب کے لئے آئی تھیں۔ جب دریا کے کنارے پر کھڑے ہو کر انہوں نے برقعے اٹھائے تو امتیاز نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کی عمر پندرہ یا سولہ سال کی تھی۔ اور دوسری تیس پینتیس سال کے لگ بھگ چھوٹی کا حسنِ گلو سوز دیکھ کر امتیاز کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور مصحف حلف اسی وقت طاق میں رکھ دیا گیا۔ اس کا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ کان بج رہے تھے۔ اور وہ ہکا بکا ہو رہا تھا۔ کیا یہ محبت تھی؟

(۲)

امتیاز نے شوفر سے معلوم کر لیا تھا کہ موٹر نیاز علی خاں رئیس کی ہے۔ اور جب اس نے ان کی صاحبزادی حسن آرا سے شادی کی درخواست کی تو انہوں نے کہا۔ سوچ سمجھ کر جواب دیا جائیگا۔ اور وہ مدت تک ٹال ٹول کرتے رہے۔ وجہ یہ تھی کہ امتیاز کی شہرت اچھی نہ تھی۔ بیان کیا جاتا تھا کہ کئی سال سے کسی عورت کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق ہے۔ اور یہ خواہ غلط نہ تھی۔ واقعی اس کی محبت اگر اسے محبت کہا جائے۔ ایک عورت سے تھی۔ مگر جب اس نے حسن آرا کو دیکھا تو وہ محبت پارے کی طرح اڑ گئی۔

وہی موتیا بیگم جسے وہ پرستان کی پری سمجھتا تھا۔ اب اسے غول صحرائی دکھائی دیتی تھی۔ اب وہ اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ اور اس کے نام پر لاحول پڑھتا تھا اس کے خط آتے تھے اور وہ پڑھے بغیر پھاڑ کر پھینک دیتا تھا،

(۳)

محبّت کا جسے محبّت کہنا چاہیئے رُوح سے تعلّق ہے۔ یہ غیر فانی ہے۔ لازوال ہے۔ بقائے دوام کی ساختہ پرداختہ ہے۔ ایک مقدّس رشتہ ہے جو مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ حیوانی جذبات اور نفسانی ولولوں کو محبّت کہنا گُناہ ہے۔ یہ ولولے فانی۔ عارضی اور چندروزہ ہیں۔ ان کا رُوح سے کوئی تعلّق نہیں۔ یہ مٹّی کے کھلونوں کی طرح بنتے اور جلد ٹُوٹ جاتے ہیں۔ امتیاز کو موتیا بیگم سے محبّت نہ تھی صرف تعلّق تھا جس کے لئے جوشِ جوانی کے سوا اور کوئی نام نہیں ہوسکتا ہاں موتیا بیگم کو اس سے محبّت تھی۔ وہ اسے اپنے دل اور جان کا مالک سمجھتی تھی۔ اس لئے جب وہ اس سے جدا ہُوا تو اس کا دل چکنا چُور ہوگیا۔ موتیا بیگم نے بیوفا امتیاز کو کئی خط لکھے مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ایک محرم راز عورت بھیجی تو وہ دل ریش پیغام لائی۔ آخر ہار کر وہ خود گئی تو امتیاز نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر پھر آؤ گی تو بُری طرح نکالی جاؤ گی تمہارے آنے

سے میری بدنامی ہے ؛

(۴)

زر میں بڑی طاقت ہے۔ یہ عیبوں کو چھپاتا ہے۔ گناہوں کا پردہ پوش ہے۔ قاضی الحاجات ہے۔ ہُنر اِس کا غلام اور خوبصورتی کنیز ہے۔ ہر چند امتیاز کی شہرت اچھی نہ تھی مگر وہ صاحب زر تھا اس لئے نیاز علی خاں نے کچھ تامل اور چندے التواء کے بعد یہ کہہ کر کہ انسان پھر انسان ہیں فرشتے نہیں ہوتے آخر امتیاز کی درخواست منظور کر لی۔ نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اور امتیاز گھڑیاں شمار کرنے لگا۔ ہماری حالت کچھ عجیب ہے۔ ہم خُوب جانتے ہیں کہ وقت ہماری عُمر کا حصّہ ہے۔ یہ گزرتا ہے۔ اور ہماری عُمر گھٹتی ہے۔ لیکن پھر بھی اپنی خواہش کے جلد پُورا کرنے کو ہم یہی چاہتے ہیں کہ یہ جلد کٹے گویا ہم اندھے اور بہرے ہو کر اپنی زندگی اپنی خواہشوں پر قُربان کر دیتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ آہ عُمر نے وفا نہ کی ؛

۵

امتیاز کا نکاح حُسن آرا سے ہو چکا تھا۔ شب عروسی تھی۔ دولھا دُلھن خلوت میں بیٹھے تھے۔ امتیاز اشتیاق مجسم ہو رہا تھا۔ حُسن آرا شرما اور لجا رہی تھی کہ دروازہ کھُلا۔ مہری ایک خط لئے ہوئے آئی اور بولی کہ حضور ہسپتال کا چپراسی یہ لایا ہے۔ اور کہتا ہے۔ نہایت ضروری ہے زندگی

اور موت کا سوال ہے۔ یہ سن کر امتیاز کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کا کلیجہ بلا وجہ بلیوں اچھلنے لگا اور اس کے دل نے گواہی دی کہ کوئی آفت آنے والی ہے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ خط لیا اور دیر تک بغور لفافہ کو دیکھتا رہا۔ مگر تحریر کو شناخت نہ کر سکا۔ اس نے چاہا۔ کہ لفافہ جیب میں رکھ لے اور کسی فرصت کے وقت پڑھے مگر لفافہ پر جلی قلم سے لکھا تھا "نہایت ضروری" ان الفاظ سے پھر از سر نو اس پر خوف طاری ہو گیا۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ اور خط پڑھتے ہی اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور لکنت آمیز زبان سے گویا ہوا۔ پیاری یہ میرے بڑے پیارے دوست کا خط ہے۔ اس وقت وہ سخت مصیبت میں گرفتار ہے۔ واقعی موت اور زندگی کا معاملہ ہے۔ وہ مجھے بلاتا ہے۔ اگر میں نہ گیا تو خدا جانے کیا ہو جائیگا۔ مجھے نصف گھنٹے کی اجازت دو میں ابھی آجاؤں گا۔ یہ سنتے ہی حسن آرا نے شرما کر سر جھکا لیا اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ امتیاز کمرے سے باہر آیا۔ موٹر منگوائی اور سوار ہونے سے پہلے اس کے لیمپ کی روشنی میں خط دوبارہ پڑھا۔ مضمون یہ تھا۔

جناب من۔ ایک لڑکی جس کا نام موتیا بیگم ہے۔ اور تمہاری آشنا ہے۔ ہسپتال میں داخل کی گئی ہے۔ اس نے ایک

بچّہ جنا ہے جو وہ کہتی ہے تمہارا ہے۔ مگر بچّہ جن کر اس کی حالت بگڑ گئی ہے۔ اُمید نہیں کہ رات کاٹ سکے وہ حالت نزع میں تمہیں بُلاتی ہے۔ اور بار بار اس تکلیف میں بھی یہ شعر پڑھ رہی ہے ؎

نزع میں بھی تری صُورت کو نہ دیکھا افسوس
مرتے مرتے بھی نہ ارمان نظر کا نکلا

اگر آپ کے پہلو میں دل ہے تو اس نیم جاں کو مرنے سے پہلے دیکھ لو وہ رحم کے قابل ہے +

راقم
ڈاکٹر رکھی کیش

(۶)

جب امتیاز مریضہ کے کمرے میں داخل ہُوا تو وہ جان توڑ رہی تھی۔ نرسیں برف استعمال کر رہی تھیں۔ خُون بند ہونے میں نہ آتا تھا۔ تولئے پر تولیہ بدلا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر سرہانے کھڑا تھا بچّہ جو ماں کی جان لے کر پیدا ہُوا تھا۔ قریب پڑا تھا۔ اور کبھی کبھی رونے لگتا تھا۔ جب وہ روتا تھا تو ماں کانپ جاتی تھی۔ موتیا بیگم کو امتیاز نے پہلے بالکل نہ پہچانا۔ لیکن موتیا نے حسرت بھری پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور

چاہا کہ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے۔ مگر کمزوری کی وجہ سے نہ اُٹھ سکے اور اس کے آنسو جاری ہو گئے۔ امتیاز کے دل میں ایک درد اُٹھا۔ گزشتہ زمانہ یاد آ گیا۔ وہ اِس کی چارپائی کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دیوانوں کی طرح بوسے دینے لگا۔ اِس وقت موتیا بیگم ضُعف اور نقاہت کی وجہ سے نہایت کمزور آواز میں جو معلوم ہوتا تھا کہ دُور سے آ رہی ہے۔ بولی۔ میں مر رہی ہوں۔ اب مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میرے مرنے کے بعد جانا۔ خدا کے لئے ابھی نہ جانا۔ میں کوئی دم کی مہمان ہوں"۔

(۷)

امتیاز کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے مریضہ کی سرد پیشانی اور لمبے لمبے پریشان بال چُومے اور کہا۔ تسلّی رکھو میں نہیں جاؤں گا"۔

چند لمحے خاموش رہ کر پھر موتیا بیگم بوجہ ضُعف بمشکل بولی۔ یہ چھوٹا بچہ تمہارا ہے۔ خدا کی قسم تمہارا ہے۔ مرتے وقت میں جھُوٹ نہیں بول سکتی۔ تُم اور صرف تُم میرے دل کے مالک تھے۔ تمہارے سوا میں نے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ وعدہ کرو کہ تم اِس بچّے کی حفاظت کرو گے"۔

امتیاز نے غم اور پشیمانی سے دیوانہ ہو کر کہا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اس بچے کی پرورش کروں گا۔ اس سے محبت کروں گا۔ اور ہمیشہ ساتھ رکھوں گا یہ کہا اور اس نے بچہ گود میں لے لیا۔ بچہ جو رو رہا تھا خاموش ہو گیا۔ بچہ کا باپ اب مریضہ کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مریضہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بار بار کلاک کی طرف جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھا دیکھتا تھا۔ مریضہ کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ جلد جلد سانس لے رہی تھی۔ صبح کے قریب مریضہ نے آخری ہچکی لی اور درد۔ تکلیف اور مصیبت سے چھوٹ گئی۔ نرس نے کہا "خاتمہ ہو گیا"۔

امتیاز اسی وقت کا منتظر تھا۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔ آخری مرتبہ مرنے والی کے چہرے کی طرف دیکھا بچے کو اُٹھا لیا اور موٹر کی طرف دوڑا۔ اس کے سوار ہوتے ہی گھڑیال نے چار بجائے۔

(۸)

اب حسن آرا کی سنو۔ خاوند کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب رات کے بارہ بج گئے تو وہ حجرۂ عروسی سے نکل کر دوسرے کمرے میں گئی جہاں اس کی خالہ جو ہائی میں اس کے ساتھ آئی تھی۔ سو رہی تھی۔ حسن آرا کے قدموں کی آہٹ پا کر اس کی خالہ کی آنکھ کھل گئی وہ اُٹھ بیٹھی اور حیران ہو کر بولی حسنا خیر تو ہے۔ تو

اِس وقت یہاں کہاں اور تیرا دُولھا کیا کر رہا ہے۔ حُسن آرا پلنگ پر خالہ کے پاس بیٹھ گئی اور اسے کہا۔ کسی دوست کا خط آیا تھا۔ جسے پڑھ کر گھبرا گئے اور یہ کہہ کر کہ ابھی آتا ہوں کہیں چلے گئے ہیں۔ جب دو بج گئے اور دولھا نہ آیا تو دُلہن نے سمجھ لیا کہ کوئی حادثہ ضرور ہُوا ہے ورنہ ساری رات خلافِ معمول گھر سے کبھی باہر نہ رہتے۔ یہ خیال اس پر ایسا غالب آیا کہ وہ رونے لگی۔ خالہ نے اسے پیار کیا اور ساتھ لٹا لیا۔ مگر سب کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ یکایک چار بجے کے بعد موٹر پھاٹک پر آکر ٹھہری اور امتیاز مکان میں داخل ہُوا۔ وہ پہلے اس کے کمرے میں گیا مگر اسے وہاں نہ پاکر دُوسرے کمرے میں جہاں دُلہن اور اس کی خالہ بیٹھی تھیں پہنچا۔ دولھا کی گود میں اس وقت ایک بچّہ تھا۔ اور آنکھوں سے آنسُو جاری تھے۔ خاوند کو روتا دیکھ کر حُسن آرا جو تعلیم یافتہ اور بڑی سمجھ دار لڑکی تھی۔ رسمی شرم کو بھول گئی اور گھبرا کر بولی۔

"صاحب خیر تو ہے۔ آپ اِس وقت بہت پریشان ہیں"؟

اِمتیاز نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔ یہ۔ یہ میرا بچہ ہے۔ اور اس کی ماں ابھی تھوڑی دیر ہوئی مری ہے۔ پھر بچّے کو جو اس وقت چلّا رہا تھا ہاتھوں پر لے کر آگے کیا۔ حسن آرا مُنہ سے کچھ نہ بولی اُٹھ کر بچّے کو گود میں لے لیا۔ اسے سینے سے لگا لیا اور پیار کیا۔ پھر وہ بھری آنکھوں سے

جن میں اس وقت آنسو تھے۔ خاوند کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ فرماتے ہیں کہ اس کی ماں مر گئی ہے"؟ امتیاز نے جواب دیا۔ "میری موجودگی میں ہسپتال میں مری ہے۔ میں چھ ماہ سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہسپتال میں بلا بھیجا تھا ——"

حسن آرا نے خالہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ یہ میری بری کا بہترین تحفہ ہے۔ ہم اس پیارے بچے کو پالیں گے ٭

کلثوم

(۱)

ہمارے پڑوس میں ایک روشن دماغ امیر رہتا تھا۔ وہ قول کا سچّا اور اصول کا پکّا تھا۔ صاف گو تھا۔ دیانت دار تھا۔ اُس میں بڑی بات یہ تھی۔ کہ اُسے قرض سے سخت نفرت تھی۔ یہی باعث تھا کہ لاہور میں اس کی بہت بڑی عزّت تھی۔ اُس کے کئی بیٹے ہوئے۔ مگر خدا کی شان سب کے سب باپ کی ضد نکلے۔ سب سے بڑا بیٹا مظفر گورا چِٹّا خوبصورت تھا۔ دُوسرا صفدر باپ کی طرح سانولا مگر ملیح۔ بڑا ماں کا ہمشکل تو چھوٹا باپ پر تھا۔ بڑا اعلےٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر اچھّے عُہدے پر ممتاز ہُوا۔ لیکن صفدر نے بڑی مُشکل سے صرف مدرسے کا کورس ختم کیا۔ افسوس مظفر بھی قرض کے بھنور میں پھنس کر سر نہ اُٹھا سکا۔ اگر وہ مقروض نہ ہوتا۔ تو شاید ہائیکورٹ کا جج ہو جاتا۔ مگر تقدیر کی تحریر کو کون مٹا سکتا

ہے۔ قرض نے اُسے تباہ کر دیا۔ بڑھاپے میں وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

(۲)

مظفر اور صفدر کی خالہ ایک غریب آدمی کی بیوی تھی۔ اِس لئے ان کی خالہ زاد بہن شکیلہ نے جو اسمِ بامسمّٰی نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ اور رنگ گورا تھا۔ بجائے باپ کے خالو کے ہاں پرورش پائی۔ شکیلہ کی ماں چاہتی تھی کہ اُس کی لڑکی مظفر سے بیاہی جائے۔ شکیلہ کو بھی مظفر سے محبّت تھی۔ مگر ہم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں اور اب پھر کہتے ہیں کہ شادیاں آسمان پر ہوتی ہیں۔ خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ مظفر کی شادی ایک اُونچے گھرانے میں ہو گئی۔ اور شکیلہ کی دامن بندی صفدر سے ہوئی۔ شادی کے بعد شکیلہ کی شگفتگی جاتی رہی۔ وہ چپ سی رہنے لگی۔ اور مظفر کے سامنے بہت کم آتی تھی اُس کی صحت میں بھی فرق آنے لگا۔ شادی سے دو سال بعد اُس کے ہاں کلثوم پیدا ہوئی۔ اور شکیلہ کی حالت روز بروز بگڑنے لگی۔ پھر سِل کا عارضہ ہو گیا۔ اور بہت جلد سُوکھ کر کانٹا ہو گئی جب مَوت کا فرشتہ اُس کے

سرہانے کھڑا تھا۔ تو اُس نے کلثوم کی طرف جس کی عمر اس وقت ایک سال کے قریب تھی۔ نہایت حسرت سے دیکھا۔ دق اور سل میں آخری وقت تک آواز برابر اور ہوش و حواس درست رہتے ہیں۔ شکیلہ نے انّا کو پکار کر کہا۔ کلثوم کو میری چھاتی پر لٹا دو۔ اسے سینے سے لگا کر وہ بولی "ٹھنڈک پڑ گئی"۔ پھر بیٹی کا منہ چوما۔ اور اس طرح آنکھیں بند کیں کہ پھر نہ کھولیں۔

(۳)

صفدر کو شکیلہ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ چند دن وہ بہت بے قرار رہا۔ مگر پھر اُسے صبر آ گیا۔ وہ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ ملازمت چھوڑ دی اور آوارہ ہو گیا۔ پھر ایک حجام سے اُس کی ایسی دوستی ہوئی کہ سب کو بھول گیا۔ جو کچھ کماتا تھا اسے کھلاتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے لئے اپنے تن کے کپڑے بھی بیچ ڈالا کرتا تھا۔ ایک بار جاڑے کے موسم میں اُس نے اپنا لحاف فروخت کر کے حجام کو روپے دئے۔ اور آپ بوریا لپیٹ کر نہایت عذاب میں رات بسر کی۔ صفدر کا باپ چونکہ اصول کا پکّا انسان تھا۔ اُس کی ان حرکات سے بہت بیزار ہوا۔ صفدر بھی جنونی ہو رہا تھا۔ باپ کی ناراضی کو خیال میں نہ لایا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ گھر سے نکالا گیا اور نانِ شبینہ کو محتاج ہو گیا۔ مگر اس حال میں بھی حجام کی محبّت کا جنون بدستور سر پر سوار تھا۔ اس نے اپنے آپ کو یہاں تک ذلیل کر لیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک دن

حجام نے اس سے کچھ مانگا۔ مگر وہ قلاش تھا کیا دیتا۔ اس پر حجام نے خفا ہو کر اُسے مارا۔ وہ ایک اخبار نویس کے پاس گیا اور رو کر کہا۔ میری اکلوتی بیٹی کا انتقال ہو گیا ہے۔ گور و کفن کے لئے کچھ دو۔ اخبار نویس نے رحم کھا کر اُسے پانچ روپے دِئیے۔ جو اُس نے فوراً حجام کے حوالے کئے اور اُسے خوش کیا۔ اِس ذلت اور رُسوائی میں کئی سال گزر گئے۔ اور کلثوم جو اپنے دادا دادی کے پاس رہتی تھی۔ جوان ہو کر دُوسری شکیلہ بن گئی ؛

(۴)

اِس طرح کب تک گزارہ ہو سکتا تھا۔ جب کش مکش حیات میں صفدر کو صحت نے بھی ماں باپ اور حجام کی طرح جواب دیدیا۔ تو وہ بیمار ہو کر باپ کے اصطبل میں جہاں گھوڑے کھڑے تھے۔ خشک گھاس پر آ لیٹا۔ اس وقت بخار سے اس کا بدن انگارے کی طرح پھک رہا تھا۔ پیاس جو لگی تو رینگ کر میلی بالٹی سے جس میں گھوڑوں کو سائیس پانی پلاتے تھے پانی پیا اور بیہوش ہو گیا۔ کلثوم کو خبر ہوئی تو خون نے جوش مارا اور وہ چیخیں مار کر روئی۔ دوڑی دوڑی دادی کے کمرے میں گئی۔ جہاں دادا جان بھی اس وقت موجود تھے۔ اور کہا۔ میرا باپ فقیروں کی طرح اصطبل میں پڑا ہے اور بیمار ہے۔ اُسے یہاں بُلا لو ورنہ میں بھی وہیں

جاتی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس وقت کلثوم کے چہرے پر کچھ اس قسم کا جلال تھا کہ صفدر کا باپ بھی جو اپنے ارادے کا پکّا تھا۔ مرعوب ہو گیا اور صفدر کی ماں اور بیٹی کو روتا دیکھ کر صفدر کو گھر میں اُٹھا لایا۔ اور کلثوم کے کمرے میں اس کا علاج ہونے لگا۔ مگر تنگی بے آرامی اور ناکامی کا زہر اپنا کر چکا تھا دو ماہ صاحب فراش رہ کر وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہُوا اور عذابِ زندگی سے چھُوٹ گیا +

(۵)

صفدر کے بعد اُس کا بڑا بھائی مظفّر کلثوم کو اپنی حقیقی بیٹی کی طرح چاہتا تھا۔ مگر کلثوم دل میں تایا سے ناراض تھی۔ وجہ یہ تھی کہ کلثوم کے دادا نے جب زندگی میں اپنی جائداد کا ہبہ نامہ لکھا۔ تو صفدر کو نافرمان پسر اور عاق قرار دے کر کچھ نہ دیا اور اس طرح چونکہ کلثوم کا باپ صفدر اپنے والد کی زندگی میں وفات پا چکا تھا۔ کلثوم کے حصّے میں کوئی جائداد نہ آئی۔ اس کا ذمّہ وار کلثوم نے اپنے تایا کو ٹھہرایا۔ جسے اُس کے دادا کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ حالانکہ ایمان کی بات یہ ہے کہ مظفّر نے بہت زور لگایا کہ صفدر کو بھی کچھ ملے لیکن اُس کی پیش نہ چلی۔ بہر کیف کلثوم کے دل میں کچھ ایسی گرہ بیٹھی کہ پھر نہ کھُلی۔ مظفر نے کلثوم کی شادی پر اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ بہت سا جہیز دیا۔ برات کو وسیع پیمانے پر

دعوت دی۔ شادی کے بعد اُس کے شوہر کو جو اس وقت بیکار تھا دو سال تک گزارہ دیا۔ مگر کلثوم صاف نہ ہوئی ؛

(۶)

کلثوم کے شوہر حمید کا باپ تو غریب آدمی تھا۔ مگر اُس کا بھائی وحید اعلےٰ عُہدہ دار اور خان بہادر تھا۔ اور یہ شادی بھی وحید کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ورنہ حمید تو اس وقت برسرِ کار نہ تھا۔ پھر دو سال کے بعد بڑے بھائی کے رسُوخ سے حمید پولیس کا سب انسپکٹر ہو گیا۔ کلثوم امیر کبیر کی پوتی تھی۔ اُس نے شاہانہ طرز پر پرورش پائی تھی۔ وہ کفایت شعاری کی خُوبی سے نا آشنا تھی۔ شوہر کے گھر میں وہ دادا کے گھر کا تزک و احتشام دیکھنا چاہتی تھی۔ اِس لئے سب انسپکٹر کی جائز تنخواہ اس کے مصارف کے لئے بے حقیقت تھی۔ حمید کو کلثوم سے محبّت تھی۔ وہ اس کی عزّت کرتا اور چاہتا تھا کہ وہ بیگموں کی طرح رہے۔ کلثوم امیر گھرانے کی لڑکی تھی فضول خرچ تھی اور ساتھ ہی فیاض و مہمان نواز بھی جب اس کا شوہر سب انسپکٹر پولیس ہو گیا تو وہ جیٹھ جٹھانی۔ اپنی بیاہی ہوئی اور کنواری نندوں اور خُسر اور سوتیلی ساس کے ساتھ فیاضی و دریا دلی سے پیش آنے لگی۔ داد و دہش کا سلسلہ دن رات جاری رہتا تھا۔ جب دیکھو اناج کی بوریاں۔ گھی کے مٹکے۔ ایندھن کے چھکڑے۔ گائیں اور بھینسیں حمید کے علاقے سے

اُس کے رشتہ داروں کے ہاں جاتی رہتی تھیں ۔ سسرال والے آتے اور کئی کئی دن مہمان رہتے تھے اور جب رُخصت ہوتے تھے تو کبھی خالی ہاتھ نہ جاتے تھے ۔ کلثوم لیڈیوں کی طرح لباس پہنتی تھی ۔ صرف فراک کوٹ جو جاڑے میں خریدا جاتا تھا تین سو سے کم میں نہ آتا تھا ۔ غرض بہت اچھا وقت تھا اور زندگی امیرانہ ٹھاٹھ کے ساتھ بسر ہو رہی تھی ۔

(۷)

ناتجربہ کار کلثوم کو یقین تھا ۔ کہ یہ خوش حالی ہمیشہ رہے گی ۔ نادان لڑکی نہیں جانتی تھی ۔ کہ ہر بہار کے بعد خزاں کا آنا ضروری ہے ۔ ایک ساعت ۔ ایک لحظہ ۔ ایک دم میں دُنیا کا حال دگرگوں ہو جاتا ہے اور زمانہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے ۔ ادھر کلثوم مہمانداری اور اسراف میں مصروف تھی ۔ اِدھر انقلاب کا زبردست ہاتھ قلم کاری کر رہا تھا ۔ کلثوم کا دادا جسے بڑھاپے میں بینائی جواب دے چکی تھی ۔ اِس جہانِ فانی سے رُخصت ہو گیا ۔ اُس کا تایا ایک سازش کی وجہ سے قبل از وقت پنشن لے کر گھر آ گیا ۔ کلثوم کے چچاؤں نے بروئے ہبہ نامہ اپنے اپنے حصّے کی جائداد پر قبضہ کر لیا ۔ اور پہلے درجے کے بے دید ثابت ہو گئے ۔ کلثوم کی دادی بدستور اپنی جہازی حویلی میں رہتی تھی ۔ اور زمین کی آمدنی پر اوقات بسر کرتی تھی ۔ مگر اقبال کے درخت کی جڑ کو دیمک

لگ چکی تھی۔ اس پر غضب یہ ہُوا۔ کہ حمید پر یکایک فالج گرا۔ اور گو وہ کچھ عرصہ تصویر بہالی رہ کر اُٹھ تو کھڑا ہُوا مگر دماغ میں کسی قدر فتور آ گیا۔ اور جب پھر اسی نوکری پر حاضر ہُوا۔ تو حد سے زیادہ بے اعتدالی کی وجہ سے بدنام ہو گیا۔ حکام کو اس کے بڑے بھائی کی خدمات کا پاس تھا۔ اِس لئے فوجداری قانون کی گرفت سے تو نجات ہو گئی۔ مگر اُسے ملازمت سے علیحدہ ہو جانے پر مجبور کیا گیا۔ اور چونکہ اسراف کی وجہ سے وہ کچھ پس انداز نہ کر سکا تھا۔ معاً افلاس کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا۔ ناداری کے آتے ہی سب نے آنکھیں پھیر لیں۔ کلثوم کے سُسرال والے جو اس پر صدقے قُربان ہوتے تھے۔ جو حمید کو دل کا سرور اور کلثوم کو آنکھوں کا نُور سمجھتے تھے۔ اب ان کی شکل سے بھی بیزار ہو گئے۔ اور کچھ ایسے بدلے کہ کلثوم کا جیٹھ کے گھر میں رہنا دُشوار ہو گیا۔ جب بیمار حمید! نادار حمید اپنی بیگم مزاج دریا دل بیوی کو لے کر بڑے بھائی کے گھر سے نکلا تو اس کی حالت زبانِ حال سے کہ رہی تھی ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کُوچے سے ہم نکلے

سُسرال والوں کی بے اعتنائی سے دل شکستہ ہو کر کلثوم دادی کے ہاں آ گئی۔ اور یہاں جو اس کی حالت تھی۔ محتاجِ بیان نہیں۔ دادی جو خود اسراف کا شکار ہو چکی تھی۔ اُس کی بھلا کیا امداد کر سکتی تھی۔ ہاں روٹی مل جاتی تھی۔ حمید کو

کلثوم کی جدائی ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ تھی۔ مگر کیا کرتا ہار کر اُسے دادی کے پاس چھوڑ گھر سے نکلا۔ اس نے کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس اور کراچی میں ہر چند خاک چھانی مگر روزگار نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر مایوس و ناکام واپس آگیا۔"

(۹)

ناداری! ناداری!! تیرا رُو سیاہ ہو۔ تُو مصیبتوں کی جان اور آفتوں کا ایمان ہے ہاں تُو ذلت و رُسوائی کی کان ہے۔ تیرے خونخوار پنجے ہیں جو ایک بار گرفتار ہو جائے۔ پھر قسمت ہی سے چھٹکارا ہوتا ہے۔۔یہی حال کلثوم کا ہُوا۔ پھر اُسے راحت نصیب نہ ہوئی۔ اور زندگی کانٹوں کا بستر ہو گئی۔ گھر کا کاٹھ کباڑ تو شروع شروع میں علیحدہ ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد زیور بکا۔ پھر پہننے کے کپڑے بھی نہ رہے اور آخر ضروریات زندگی مہیا ہونے کا بھی کوئی ذریعہ نہ رہا۔ اس نازک وقت میں ایک دن وہ بھلی چنگی رات کو کوٹھے پر سوئی تھی۔ کہ دو بجے کے قریب آنکھ کھُل گئی۔ اور طبیعت مالش کرنے لگی۔ پھر لحظہ بلحظہ طبیعت بگڑنی شروع ہوئی۔ کئی بار قے آئی اور اجابتوں نے نیم جان کر دیا۔ تایا کو خبر ہوئی تو فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ اُس نے کہا۔ مریضہ کو ہیضہ ہو گیا ہے۔ نسخہ لکھا اور دوا دی۔ باقی رات سب نے جاگ کر گزاری۔ علے الصباح اُس کے تایا اور تائی اور تایازاد بھائی نے

مشہور سے مشہور ڈاکٹر بلائے۔ جنہوں نے ٹیکے لگائے۔ پچکاری سے پانی
اُس کے جسم میں داخل کیا۔ اور خواب آور دوا دی۔ جس وقت کلثوم کے
تایا نے ڈاکٹروں کے آنے سے پہلے چند روپے کلثوم آہ نادار کلثوم کے
سرہانے فیس کے لئے رکھے۔ تو اُس نے حسرت خیز آنکھوں سے ان کی
طرف دیکھا اور اُس کے تایا کو یہ معلوم ہُوا۔ کہ اُس کی آنکھیں ہُو بہُو
شکیلہ کی آنکھیں ہیں۔ جن آنکھوں سے اُس نے حالتِ نزع میں کلثوم
کی طرف دیکھا تھا۔ کلثوم کے تایا زاد بھائی اور اُس کی تائی نے بہت
کوشش کی۔ مگر کچھ پیش نہ جاسکی۔ اور چار بجے کے قریب نادار
کلثوم ہزاروں حسرتیں اور ارمان لے کر اس دارفانی سے نامُراد و ناشاد
رُخصت ہوگئی۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلیہ رَاجعُون ٭

دوزخ کا کُتّا

مسٹر ڈین کو مَیں مدّت سے جانتا ہوں، یہ نہ سمجھے کہ میرا روئے سخن کسی انگریز کی طرف ہے، نہیں ہرگز نہیں، میری مراد ایسے شخص سے ہے، جس کا دادا مسلمان تھا، جس کا باپ مُسلمان تھا، اور جو آپ بھی مسلمان کہلاتا ہے، مگر در اصل نہ مسلمان ہے نہ ہندو نہ عیسائی نہ گبر، وہ ہر مسالے پپلامول ہے، نام اس کا الہ دین ہے اور لکھتا لیے، ڈین ہے، وہ ان لوگوں میں سے ہے، جو اگر قریشی ہیں تو اپنے آپ کو ترشی، اگر خان ہیں تو خین، اگر علی ہیں تو الائی لکھتے ہیں تاکہ جب اُن کا نام لیا جائے تو لوگ انہیں انگریز سمجھیں مگر میرے خیال میں وہ خبطی ہیں، گدھا اگر اس پر جلِّ اطلس ہو پھر بھی گدھا ہے اور کوّا ہر حال میں کوّا ہے، کبھی ہنس نہیں ہو سکتا، خیر، کچھ بھی ہو چونکہ یہ شخص اپنے آپ کو "ڈین" لکھتا ہے، مناسب ہے کہ ہم بھی اسے اِسی نام سے پُکاریں +

(۲)

مسٹر ڈین نے جب دو سال کی تعلیم کے بعد کالج چھوڑا تو کوئی عیب نہ تھا جو اس میں نہ پایا جائے، وہ شتر کینہ تھا، بد باطن تھا، سیاہ قلب تھا، مغرور تھا، فرعون بے سامان تھا، کبھی کبھی خدا کی ہستی سے بھی منکر ہو جاتا تھا، ہمیں ٹھیک تو معلوم نہیں لیکن افواہ ہے، کہ وہ کالج سے کسی نازیبا حرکت کی وجہ سے بے دخل کر دیا گیا تھا، اور جب لاہور سے داغ بدنامی پیشانی پر لے کر اپنے گھر گوجرانوالہ گیا تو باپ نے اسے اس وجہ سے کہ وہ نہایت گستاخ، زبان دراز اور بدچلن تھا تنگ آ کر عاق کر دیا اور بیک بینی و دو گوش گھر سے نکال باہر کیا، اب وہ دھوبی کا کتا تھا گھر کا نہ گھاٹ کا، لیکن تھا بڑا چلتا پرزہ بلکہ آتش کا پر کالہ پادریوں تک کسی نہ کسی طرح جا پہنچا، اور انہیں کچھ ایسا چکمہ دیا کہ وہ اُسے اپنا سمجھنے لگے۔ پھر ایک بارسوخ پادری کی امداد سے افریقہ جا پہنچا، اور دارالسلام میں اُسے ایک معقول اسامی مل گئی، اُن ایّام میں وہاں ہندوستانیوں کی بڑی قدر تھی، اور معقول تنخواہیں ملتی تھیں مسٹر ڈین کو جب پانسو شلنگ ماہوار ملنے لگے تو کھل کھیلا، تنخواہ پانسو شلنگ تھی اور خرچ ایک ہزار شلنگ، بہت جلد مقروض ہو گیا، اور قرضخواہوں کے تقاضے سے تنگ آ کر ایک جعلی چک بنایا مگر

سر منڈاتے ہی اولے پڑے، جعلسازی پکڑی گئی پولیس نے چالان کیا اور عدالت سے تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ جب میعاد قید کے اختتام پر رہا ہوا تو افریقہ میں اس کا رہنا دشوار ہو گیا، ہر چند ہاتھ پاؤں مارے مگر کسی نے منہ نہ لگایا، اس لئے ہار کر پھر ہندوستان کا رخ کیا۔

(۳)

ہندوستان میں ابھی بی۔ اے اور ایل، ایل، بی، پندرہ روپے ماہوار پر ملازمت کے لئے تیار نہ تھے، ایم، اے بارہ آنہ یومیہ پر کام کرنے کو آمادہ نہ تھے، گریجویٹ تنگدستی سے مجبور ہو کر خودکشی کو ردِ مصیبت نہ سمجھتے تھے، ابھی قانون پیشہ اصحاب نان شبینہ کو محتاج نہ ہوئے تھے، اس لئے لاہور میں جہاں اس کے گزشتہ حالات کسی کو معلوم نہ تھے صرف اس وجہ سے کہ وہ انگریزی خوب بولتا تھا ایک معزز و ممتاز انگریزی اخبار کا لوکل رپورٹر ہو گیا، اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار لینے لگا۔ یہ اخبار کسی یورپی کمپنی کی ملکیّت تھا، جس کا ایڈیٹر اور منیجر انگلستان کے انگریز تھے، انہیں مسٹر ڈین نے جب بتایا کہ وہ عیسائی ہے تو اسے آسانی سے نوکری مل گئی، اگر مسٹر ڈین کے اعمال کی طرف دیکھا جاتا تو وہ اس قابل تھا، کہ اسے نان غم اور آب مصیبت ملتا، مگر

ہمارا خدا بڑا غفور الرحیم ہے وہ جُرم دیکھتا ہے اور رزق، دریا دلی سے دیتا ہے، کاش، ہم فانی انسان بھی ستّار عیوب کی رحم دلی سے سبق حاصل کریں اور ابنائے جنس کی کمزوریوں پر غضبناک ہو کر دیو انتقام نہ بنیں ؂

(۴)

اب مسٹر ڈین ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ لے رہا تھا، اِس لئے اُس کے باپ کا غُصّہ کم ہو گیا اور باپ کے رشتہ دار اُس سے ملنے جُلنے لگے، باپ کا غُصّہ بیشک کم ہو گیا۔ مگر وہ اسے عاق کر کے دُوسری شادی کر چکا تھا، اور دُوسری بیوی سے اب اس کے ہاں دو بچّے تھے۔ مسٹر ڈین کی ماں زندہ نہ تھی اِس لئے رشتہ داروں کے کہنے سُننے سے صُلح تو ہو گئی مگر باپ نے ناخلف بیٹے کو اپنا وارث تسلیم نہ کیا، اور یہ بھی منظور نہ کیا کہ گستاخ اور خدا کا منکر بیٹا جب گوجرانوالہ آئے تو اُس کے ساتھ رہے، پھر بھی مسٹر ڈین دُوسرے تیسرے مہینے گوجرانوالہ ضرور آتا تھا، اور اپنی پھوپھی کے ہاں قیام کیا کرتا تھا، اسکی خواہش تھی کہ کسی طرح اُس کی شادی اپنی برادری میں ہو جائے مگر اُس کی برادری اُس کے حال، خُوبُو، چال چلن اور عقیدہ سے واقف تھی اِس لئے جہاں اُس کی پھوپھی پیغام لے کر گئی، وہاں سے ٹکا سا

جواب ملا اور سب نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

اتفاق سے جن ایام میں مسٹر ڈین کی پھوپھی بھتیجے کے لئے رشتہ ڈھونڈ رہی تھی میں لاہور میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھا، میری گھروالی گوجرانوالہ کی ہے، مائی بیگو میری اہلیہ سے ملی اور امداد کی طالب ہوئی، خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ میری لڑکی کی ایک ہم جماعت اور سہیلی فرخندہ تھی، فرخندہ کا باپ مر چکا تھا، ماں زندہ مگر بڑی غریب تھی، گوٹا بُن کر اپنا اور بیٹی کا پیٹ پالتی تھی، فرخندہ کی ماں کا ہمارے ہاں بہت آنا جانا تھا، وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ بیوی میں بُوڑھی ہوگئی ہوں اور بیمار رہتی ہوں فرخندہ اب جوان ہے، بیس اکیس سال کی ہوگئی ہے۔ کوئی صُورت نکالو کہ میری زندگی میں یہ اپنے گھر آباد ہو جائے، بدقسمتی سے جس دن مائی بیگو آئی اُس دن فرخندہ کی ماں بھی موجود تھی، میری اہلیہ نے اس سے ذکر کیا اور اُس نے جب سُنا کہ طالب نکاح ڈیڑھ سو روپے ماہوار کماتا ہے تو اس کے مُنہ سے رال ٹپکنے لگی اور فوراً رضامند ہوگئی، شام کو جب میں کچہری سے واپس آیا تو مسٹر ڈین ہمارے ہاں موجود تھا، اور معاملہ قریب قریب طے ہو چکا تھا، مَیں نے سخت مخالفت کی اور اس قدر تعجیل کو خلاف مصلحت قرار دیا، مگر اب یورپی تہذیب ہندوستان پر بادل کی طرح محیط ہے اب اگلے زمانے کی دھرم بیٹیاں اور لاجونتیاں

بہت کم نظر آتی ہیں، اب بیوی خاوند کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے، اب عورتوں کے دماغ میں یہ بات سما گئی ہے۔ کہ وہ مَردوں سے افضل ہیں، بہتر نصف ہیں، ان کا کام یہ نہیں کہ وہ بچّے جنیں، اولاد کو تربیت دیں، اُسے صالح اور نیک بنائیں، گھر کو سنبھالیں اور خاوند اور اولاد کو ہر طرح کا آرام دے کر اُن کی ہستی کو فردوس حیات بنائیں بلکہ ان کا فرض یہ ہے کہ حقوق خانہ داری کو فراموش کر کے، مجلسوں اور کونسلوں میں جا کر چیخیں چلائیں اور شور مچائیں، بازاروں میں گیت گائیں اور نعرے ماریں، دُکانوں پر پہرے دیں، اگر خاوند کو وقت پر روٹی نہیں ملتی یا اُس کی ضروریات کا انتظام نہیں ہوتا تو بلا سے، اگر بچّے آوارہ پھر رہے ہیں تو بھاڑ میں جائیں۔ ان کے لئے معراج کمال صرف یہ ہے، کہ آزادی کا ڈنکا بجائیں اور جیل خانوں میں جائیں۔ ہاں عورتوں کے دماغ میں یہ سما گیا ہے کہ مرد عُضو معطّل ہیں۔ اُنہیں معزول کر دیا جائے، اور جو کام صرف مردوں کے لئے مخصوص ہیں، وہ عورتیں کریں۔ آہ یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ گھروں کو برباد، زندگیوں کو تباہ اور مُلک پر ادبار نازل کر رہی ہیں +

میری بیوی نے میری رائے کو ٹھکرا دیا، چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔ اور فرخندہ مسٹر ڈین کی بیوی بن گئی، خاوند نے بیوی کو "یاسمین" کا

خطاب دیا شادی کر کے دولہا دُلہن کو گوجرانوالہ لے گیا، مگر باپ نے مُنہ نہ لگایا اور صاف کہہ دیا کہ جاؤ اپنا راستہ لو میرے گھر میں تمہارے اور تمہاری بیوی کے لئے جگہ نہیں، یہ سُن کر وہ اپنی زوجہ کو لاہور لے آیا اور فرخندہ کی والدہ کو باورچن کی حیثیت میں اپنے پاس بُلا لیا، اِس طرح چھ مہینے گزر گئے، پھر مسٹر ڈین نے پیٹ سے باہر پاؤں نکالے اور کہا۔ مجھے ہندوستان کی آب و ہوا موافق نہیں، مرض سل کا آغاز ہے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ افریقہ چلا جا، ورنہ جان کے لالے پڑ جائیں گے، یہ سُن کر فرخندہ پریشان ہوئی اور میری بیوی کے پاس شکایت لے کر آئی، اُنہوں نے اُسے بلا کر سمجھایا، مگر وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا، ضد سے باز نہ آیا اور بولا ہر انسان کے لئے جان بچانا فرض ہے یہاں رہنا موت کو دعوت دینا ہے، آخر یہ ہُوا کہ مسٹر ڈین نے نوکری چھوڑ دی اور بیوی کو یقین دلا کر کہ وہ بہت جلد اسے افریقہ بلا لے گا، رُخصت ہوگیا، وعدہ یہ تھا کہ تین ماہ کے اندر اندر پاس بُلا لوں گا۔ مگر تین مہینے گزر گئے، چھ مہینے گزر گئے، نو مہینے گُزر گئے، ایک سال گزر گیا، نہ بلانا تھا نہ بلایا، ایک سال کے بعد خط آیا کہ میں مجبور ہوں، ابھی تک نوکری نہیں ملی اب میں نے کنجڑوں کا کام شروع کیا ہے، جس وقت ہاتھ میں کچھ آیا خرچ بھیجوں گا، ایک سال اور گُزر گیا مگر خرچ نہ آنا تھا نہ آیا، ہاں خط آیا کہ

دُکان نہیں چلی اب مدرسہ جاری کیا ہے، مَیں محتاج ہوں جس وقت کچھ کماؤں گا بھیجوں گا، پھر دو سال گزر گئے، مگر نہ خرچ آیا نہ کوئی خط۔

(۵)

فرخندہ اور اس کی ماں کی حالت ناگفتہ بہ تھی، میرا تبادلہ امرت سر ہو چکا تھا، ایک دن ماں بیٹیاں وہاں آئیں اور میری بیوی سے ملیں، اُن کی شکستہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی، ماں کا پاؤں سوجا ہُوا تھا۔ روتی تھی اور کہتی تھی، کہ پاؤں پر سے تانگے کا پہیہ گزر گیا تھا، کئی دن چارپائی پر پڑی رہی اب بمشکل لکڑی کے سہارے سے چلتی ہوں میں نے افریقہ میں اپنے دوستوں کو خط لکھے تو معلوم ہُوا کہ مسٹر دین نے مدرسہ کھولا تھا مگر ایک مکروہ جرم کا قرار پاکر چار سال کے لئے قید ہو گیا ہے، کچھ نہ پُوچھو کہ جلد بازی سے فرخندہ نے کس قدر مصیبت برداشت کی، خدا کرے ایسی مصیبت دُشمن کی بیٹی پر بھی نہ آئے، وہ زندہ تھی مگر مُردوں سے بدتر، میری بیوی پچھتاتی تھی مگر اب پچھتاوا فضول تھا ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(۶)

ایک دن جو ماں بیٹی میرے ہاں پھر آئیں تو اِن دُکھیاریوں کو

دیکھ کر میرا جی بھر آیا۔ اور مَیں نے خدا سے رحم کی دُعا مانگی، خدا کی شان ایک ماہ کے بعد مجھے ایک رجسٹری شُدہ لفافہ ملا، کھولا تو اس میں مسٹر ڈین کا خط تھا، جس کے ساتھ طلاق نامہ مضمون خط یہ تھا۔

"جناب عالی ڈپٹی صاحب! ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تجھے سِل ہے تو اپنی بیوی کو طلاق دیدے، اِس لئے مجبور ہوں، یاسمین کو یہ طلاق نامہ دیدیں، اور کہیں کہ مجھے معاف کرے میں خود زندہ درگور رہوں اور نادار، اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو مَیں اُسے ضرور بھیجتا"۔

راقم :- اے۔ ڈین

مَیں نے اُسی وقت اردلی بھیج کر فرخندہ اور اُس کی ماں کو لاہور سے بلایا اور طلاق نامہ ان کے حوالے کیا۔ فرخندہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ مجھ سے لیا اور رونے لگی، میں نے کہا بیٹی شُکر کر کہ تیری خلاصی ہوئی، جس مُوذی کے چنگل میں تُو گرفتار تھی وہ انسان نہ تھا "دوزخ کا کُتّا" تھا۔

ستم رسیدہ

(۱)

محمد رمضان ڈبی بازار میں بساطی کی دُکان کرتا تھا۔ وزیر بیگم اُس کے چچا کی بیٹی تھی محمد رمضان کی عُمر سولہ سال، کی تھی اور وزیر کی تیرہ سال کی۔ کہ دونوں کی شادی ہو گئی۔ دونوں خوش شکل تھے۔ میاں بیوی میں محبّت تھی۔ بیوی شوہر پر حکمران تھی۔ اور خاوند بیوی کا تابع فرمان۔ جس گھر میں محبّت جلوہ گر ہو۔ وہ بہشت بن جاتا ہے۔ اور جہاں یہ نہ ہو وہ دوزخ ہے۔ محمد رمضان کا گھر خلد تھا۔ فردوس بریں تھا۔ دن عید تھا رات شب برات تھی۔ ایمانداری سے روزی کماتا اور بیوی کو ہر طرح خوش رکھتا تھا۔ جو گھر میں سیاہ اور سفید کی مالک تھی۔ بیوی اُس کی اقلیم دل کی ملکہ تھی ؛

(۲)

سولہ سال گزر گئے! اور چونکہ یہ مسرت کے ایام تھے۔ جاتے ہوئے دکھائی نہ دیئے یوں تو میاں بیوی بہت خوش تھے۔ مگر سولہ سال کے بعد بد قسمتی سے میاں کے دل میں اولاد کی ہوس پیدا ہوئی۔ بیوقوف خاوند کو یہ نہ سوجھی۔ کہ مال اور اولاد دُنیا میں فتنے ہیں۔ اور تمام جہان کے فساد۔ بکھیڑے۔ جھمیلے اور عذاب مال اور اولاد کی بدولت ہمیں دیکھنے اور جھیلنے پڑتے ہیں۔ ہم اولاد کے لئے مصیبت اُٹھاتے ہیں۔ خود تکلیف میں پڑتے ہیں۔ اور اولاد کو آرام دیتے ہیں۔ جہاں اولاد کا پسینہ گرے۔ وہاں خون بہانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر جو انجام ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بہت کم ایسے فرزند ہیں۔ جو سعادت مند ہوں۔ اکثر بیٹے ناہموار ہوتے ہیں۔ اور جناب سعدی شیرازی نے اُن کی شان میں جو کچھ کہا ہے۔ بالکل بجا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار اگر وقتِ ولادت مار زایند
ازاں بہتر بہ نزدیکِ خردمند کہ فرزندانِ ناہموار زایند

(۳)

محمد رمضان کے پڑوس میں ایک دولتمند ساہوکار رہتا تھا۔ اس کے تین بچے تھے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بیٹے سے اُسے بڑی محبت

تھی۔ اُسے نواب زادوں کی طرح پالا۔ پڑھایا لکھایا۔ ولایت بھیجا! ور اپنی محنت اور ظلم و ستم کی کمائی اِس پر بے دریغ صرف کی۔ آخر ہندو ساہوکار کا نُور بصر جب ولایت سے واپس آیا۔ تو اس کی کایا پلٹ چکی تھی۔ وہ باپ کی طرزِ زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ شہر کی سکونت اُس کے لئے کسرِ شان ہو گئی۔ کُوچے اور بازار سنڈاس بن گئے۔ ہندوستانی لباس میں اُسے کانٹے چُبھنے لگے۔ وہ شہر کے باہر کوٹھی میں جا رہا۔ اُس کا خُون سفید ہو گیا۔ اور باپ کی شفقت۔ اُس کے تمام احسان یک قلم بھُول گیا۔ جب باپ کو طاعون کا مرض ہُوا۔ تو چھُوت کے خوف سے بیمار پُرسی کو بھی نہ آیا۔ اور جب شفیق باپ اِس جہان سے رخصت ہو گیا۔ اور اُس کی ارتھی ٹکسالی دروازے سے باہر نکلی۔ تو وہ موٹر میں سوار ہو کر دو منٹ کے لئے آیا۔ اور واپس چلا گیا۔ جب لوگ اُس کے طاعون زدہ باپ کی نعش چِتا کی طرف لے جا رہے تھے۔ تو وہ اُس وقت بھی نہایت اطمینان کے ساتھ چرٹ پی رہا اور اُس کا دُھواں ریل کے انجن کی طرح مُنہ سے چھوڑ رہا تھا۔ محمد رمضان کو یہ حال معلوم تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کی خواہش روز بروز بڑھ رہی تھی ؂

(۴)

محمد رمضان نے اولاد کی آرزو میں وہ کچھ کیا۔ جس سے اُس کے ایمان میں خلل آگیا۔ اُس نے تعویذ لئے۔ گنڈے منگوائے۔ ٹونے کئے۔ منتر پڑھے۔ مزاروں پر جا کر دست سوال دراز کیا۔ اور دامنِ مُراد پھیلایا۔ مگر کشت تمنا ہری نہ ہوئی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ برہنہ پا کسی خانقاہ کی طرف جا رہا تھا۔ کہ راہ میں مدرسہ کے زمانہ کا ایک دوست دوچار ہوا۔ دوست کیا ملا۔ اس کے سروپ میں بدقسمتی نمودار ہوئی۔ اِس شخص نے اُسے کہا۔ کہ پشاوری پیر جس کا نام ——— ہے۔ بڑا خدا رسیدہ بزرگ ہے وہ اپنے وقت کا غوث ہے۔ قُطب ہے۔ سالک ہے ابدال ہے۔ موکل اُس کے حکم میں ہیں۔ شیاطین اُس سے کانپتے ہیں۔ دیو اور جنّ اُس کا لوہا مانتے ہیں۔ تم اگر چاہتے ہو کہ ہماری آرزو پُوری ہو۔ تو اپنی زوجہ کو لے کر وہاں جاؤ۔ مطلب براری ہوگی۔ پیر کے آستانے سے آج تک کوئی محروم نہیں آیا۔ جو وہاں جاتا ہے۔ گوہر مقصود پاتا ہے ۔

(۵)

محمد رمضان نے گھر آکر وزیر بیگم سے مشورہ کیا۔ تو اُس نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اور کہا کہ اولاد میری قسمت میں نہیں۔ مَیں پشاور نہ جاؤں گی۔ مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ محمد رمضان کو شیطان ورغلا چکا

تھا۔ اُس نے بیوی کو آخر منا لیا۔ دونوں سوغاتیں لے کر پشاور گئے۔ اور پیر جی کے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ پیر کا نوابی کارخانہ دیکھ کر دنگ ہو گئے۔ لنگر لگا ہُوا تھا۔ دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور لذیذ کھانوں کی خوشبو سے دماغ معطّر ہو رہا تھا۔ حسبِ دستور مرید وزیر بیگم کو زنان خانہ میں لے گئے۔ اور محمد رمضان کو مردانہ میں اُتارا۔ رات کو اُسے مُرغ پلاؤ اور قورمہ ملا۔ اور صُبح اُسے پیر کی حضوری میں حاضر کیا گیا۔ محمد رمضان نے دیکھا کہ پیر ایک جوان۔ دراز قد۔ آہو چشم۔ سُرخ و سفید انسان تھا۔ جس کی مونچھیں لمبی لمبی اور خنجر نما تھیں۔ پیر نے رمضان کی درخواست نہایت بے پروائی سے سُنی۔ اور کچھ تامل کے بعد کہا "ہم تیرے لئے دُعا کریں گے تُو مہمان خانہ میں قیام کر"۔ اتنا کہہ کر اُسے رُخصت کیا۔

(۶)

سات دِن گزر گئے اُسے پیر کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔ اور نہ اُسے وزیر بیگم ہی سے ملایا گیا۔ ایک مرید نے صرف اتنا کہا کہ حضور آجکل وظیفہ کر رہے ہیں۔ فارغ ہو کر تجھے بُلائیں گے۔ تیری بیوی کو انہوں نے ایک عمل بتایا ہے۔ وہ چلہ میں ہے۔ ابھی وہ مرد کے رُوبرو نہیں ہو سکتی۔ محمد رمضان یہ سُن کر چُپ ہو گیا۔ لیکن اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے پیدا ہونے لگے۔ آخر اُسے اپنی حماقت کا خمیازہ

اُٹھانا پڑا۔ ایک دِن جو وہ حسبِ معمول بیدار ہُوا۔ تو پشاوری پیر اور اُس کا عملہ غائب تھے۔ دریافت سے معلوم ہُوا۔ کہ حضور ایک مُرید کی درخواست پر کابل تشریف لے گئے۔ یہ سُن کر محمد رمضان پر بجلی گر گئی ؛

(۷)

بیوقوف طالب اولاد نے پولیس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ تمام پشاور کی خاک چھانی۔ مگر بے سُود۔ قندھار گیا۔ کابل پہنچا۔ غزنی کے بازاروں میں باولوں کی طرح چکر لگائے۔ مگر نہ تو پشاوری پیر کہیں نظر آیا۔ نہ وہ شمع شبستان دلبری دکھائی دی۔ مایُوس ہو کر محمد رمضان لاہور واپس آیا۔ جاتی دفعہ مکان مقفّل کر گیا تھا۔ گیا تھا صرف دو چار دِن کے لئے۔ اور واپس پُورے چھ ماہ کے بعد آیا۔ اب وہ اگلا سا خوش مزاج۔ خندہ پیشانی حسین محمد رمضان نہ تھا۔ اب وہ خاصہ سِڑی اور سودائی تھا۔ اب اُسے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ مکان میں داخل ہُوا۔ اور بند کمرے کا دروازہ کھولا۔ تو اس میں ابھی تک وزیر بیگم کے معطّر لباس کی خوشبو موجود تھی۔ اس خوشبو نے بارُود کے انبار کو فتیلہ دکھا دیا۔ اُس نے ایک آہ کی۔ گریبان چاک کیا۔ اور جوشِ جنوں میں گھر کو آگ لگا دی۔ رات کا وقت اہلِ محلّہ اُس وقت خبردار ہوئے۔ جب مکان مشعل کی طرح جل رہا تھا۔ بڑی مُشکل سے آگ بُجھانے والے انجن نے

قُرب و جوار کے مکان بچائے۔ لیکن محمد رمضان کا تمام سامان تباہ اور گھر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ جب اُسے آگ کے شعلوں سے نکال کر ہسپتال لے گئے۔ تو وہ نہ زندوں میں تھا۔ نہ مُردوں میں ؛

(۸)

محمد رمضان تین مہینے ہسپتال میں زیر علاج رہا۔ اِس عرصہ میں اس کی دُکان جو کئی ماہ سے بند تھی۔ برباد ہو گئی۔ مالک دُکان نے کرایہ کا دعوےٰ کر کے قُرقی کا وارنٹ حاصل کیا۔ اور قارق نے قُفل شکنی کر کے دُکان کا سامان نیلام کر دیا۔ تین ماہ تک محمد رمضان ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں معالجوں کا تختۂ مشق بنا رہا۔ جب شفاخانہ سے رخصت ہُوا۔ تو اُس کی طاقت گویائی اور سماعت زائل ہو چکی تھی۔ وہ اب پاگل تو نہ تھا۔ مگر دیوانوں سے بدتر۔ وہ اب روزی کمانے کے قابل نہ تھا۔ اِس لئے نانِ شبینہ کو محتاج ہو گیا۔ اب اس سے یہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ دریُوزہ گری کر کے آتشِ شکم فرد کر سکے۔ اب وہ اُسی ہم جماعت کے گھر ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ جس نے اُسے پشاوری پیر کا پتہ دیا اور جس کی تحریک پر وہ بیوی کو لے کر پشاور پہنچا۔ وہ اس کے حالِ زار پر رحم کر کے دو وقت کی روٹی کا سلوک کر رہا تھا ؛

(۹)

اس اہم جماعت کا نام جو محمد رمضان کی بربادی کا باعث ہوا۔ محمد دین تھا۔ وہ باپ کا اکلوتا بیٹا اور بہت بڑی جائداد کا وارث تھا۔ لیکن چونکہ باپ زندہ اور انتہا کا بخیل تھا۔ اس لئے محمد دین کو صرف چار سو روپے ماہوار جیب خرچ دیتا تھا۔ محمد دین کا تعلق لاہور کی ایک مشہور رقاصہ سے تھا۔ اس لئے چار سو روپے میں پوری نہ پڑتی تھی۔ اور قرضہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھ رہا تھا۔ یہ محمد دین ایک مُوذی ساہوکار کے چنگل میں گرفتار تھا۔ جو اسے دریا دلی سے قرضہ دے رہا اور سَو دے کر ہزار لکھوا رہا تھا۔ دو سال کے تعلق کے بعد محمد دین نے اس رقاصہ سے نکاح کر لیا اور اُسے اپنے گھر لے آیا +

(۱۰)

تین سال گزر گئے۔ ہاں بیوی سے جُدا ہوئے تین سال گزر گئے۔ اس وقت محمد رمضان کی عُمر ۳۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر قلب ماہیت کا یہ عالم تھا۔ کہ وہ اسّی سال کا بُڈھا معلوم ہوتا تھا۔ بال برف کی طرح سفید تھے۔ دانت گر چکے تھے۔ چہرے پر جھریاں موجود تھیں اور شمشاد نما قد کمان بنا ہُوا تھا +

(۱۱)

ایک دن کا ذکر ہے کہ محمد دین کے سکونتی مکان میں ایک جلیل القدر مہمان رُعب داب کے ساتھ تشریف فرما ہوا۔ محمد دین نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اور حد سے زیادہ تواضع کی۔ محمد رمضان نے بھی اِس مہمان کو جس کی خدمت میزبان خادم کی طرح کر رہا تھا۔ دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں خُون اُتر آیا۔ یہ مہمان جس کی اس وسیع پیمانے پر آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ وہی پشاوری پیر تھا۔ جس نے ایک بے گناہ مسلمان کو تباہ اور برباد کیا تھا۔ لیکن اب بیکس اور بے بس تھا۔ یہ اب پرشکستہ اور بازو بریدہ تھا۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ خونِ جگر پی کر رہ گیا۔ لیکن دل میں درد اُٹھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

(۱۲)

پشاوری پیر ایک ہفتہ تک محمد دین کا مہمان رہا۔ ان ایام میں میزبان کی دلنواز رقاصہ جو اب اُس کی منکوحہ تھی۔ بے پردہ اور بے نقاب پیر صاحب کے رُوبرو ہوتی۔ اور اپنی رُوح پرور خوش الحانی سے انہیں مسرور کرتی تھی۔ یہاں بھی وہی ہوا۔ جو محمد رمضان کی پری پیکر بیوی سے ہوا تھا۔ یہ عورت بھی زہرہ بیگم کی طرح پیر کی آہو مثال آنکھوں۔ دراز قد۔ شنجرفی رنگ اور خنجر نما مونچھوں کے اثر سے

ٹھونڈا نہ رہ سکی۔ پیر نے میزبان کو مجبور کیا۔ اور وہ ضعیف الاعتقاد عقل کا اندھا گگ گانٹھ کا پورا مرید جوش عقیدت میں انکار نہ کر سکا۔ اُس نے پیر کی موجودگی میں اپنی منکوحہ کو مطلقہ کر دیا۔ طلاقنامہ لکھا گیا۔ اور وہ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ رقاصہ کی ماں کو یہ رشتہ سوہان رُوح تھا۔ اُس کی ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی مسدود ہو چکی تھی۔ جب بیٹی طلاق لے کر گھر آئی۔ تو اُس نے رت جگا کیا۔ لیکن پیر کی روانگی کے بعد ساتویں دن سردار بیگم پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ اور کئی ماہ تک اُس کے پاس رہی۔ محمد دین کو جب یہ حال معلوم ہُوا۔ تو سخت صدمہ ہُوا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ صبر کر کے خاموش ہو رہا۔ اور جب سردار بیگم پشاور سے واپس آئی۔ تو پھر اُس کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔

بازارِ ستم

(۱)

شام چند عرف شامون ولد کاہن چند ایک سیاہ رُو اور سیاہ قلب آدمی تھا۔ اس کا جسم اور اخلاق کمزور تھے۔ زبردست انسان کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ اگر ڈرتا ہے۔ تو اپنے آپ سے ڈرتا ہے۔ شام چند سب سے ڈرتا تھا۔ وہ صرف اپنے آپ سے نہ ڈرتا تھا۔ وہ خدا سے ڈرتا تھا۔ شیطان سے ڈرتا تھا۔ لوگوں کی رائے۔ لوگوں کے دست دبازو سے ڈرتا تھا۔ زندگی سے ڈرتا تھا۔ موت سے ڈرتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے اس لئے نہ ڈرتا تھا۔ کہ اُسے معلوم تھا۔ میں کتنے پانی میں ہوں ؛

شام چند میں نہ تو ضرر رسانی کی ہمت نہ فائدہ پہنچانے کی جرأت تھی۔ اسے حُقّے کی عادت نہ تھی وُہ اوروں کی طرح قسمیں بھی نہ کھاتا تھا۔ البتہ غم غلط کرنے کو شراب پیتا تھا۔ سچ ہے شرابی کے خیال میں شراب

غم غلط کرتی ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ شگافوں پر پُل باندھتی ہے۔ دِل اُکتانے والی اشیا کی تکان کو کم کرتی ہے۔ اور خفیف ہچکولوں اور معمولی جھونٹوں میں تمہیں ریشم اور مخمل کا سہارا دیتی ہے لیکن جب وہ نازک وقت آتا ہے۔ جسے زندگی کا روگ کہنا چاہئیے۔ تو وہ نشے میں وہ چند طویل اور عمیق ہو جاتا ہے۔ توبہ توبہ کیا بتاؤں یہ کس طرح کاٹتا ہے۔ ڈنک مارتا ہے۔ کھال ادھیڑتا ہے۔ ہماری جڑ اُکھیڑتا ہے۔ ہر رگ و ریشے میں رینگتا ہے۔ اور ہڈیوں کا گودا چوس لیتا ہے۔ خدا کی پناہ۔ گرم لوہے سے داغتا ہے۔ ٹیس بن جاتا ہے۔ ہمیں انگاروں پر گھسیٹتا ہے۔ نیند کو فنا کر کے ہماری رُوح کو صدمہ پہنچاتا ہے۔

(۲)

شام چند سے شرابِ خانہ خراب کا یہی سلوک تھا۔ وجہ یہ تھی۔ کہ اُسے اپنی جورو سے بڑی محبّت تھی۔ اس کی محبّت ایک کمزور ہستی کی ذلیل اور تُند محبّت تھی۔ وہ اُسے زندگی اور موت کے ساتھ چاہتا تھا۔ جیسا کہ اس قماش کے انسانوں کا دستور ہے۔ اگر بیوی پاس نہ ہو۔ تو اس کی جان نکل جاتی تھی۔ اِس لئے شراب کے نشے میں وہ اس کی پہلو نشینی کے احساس سے غافل ہو کر سخت عذاب اُٹھاتا تھا۔

جتنی چیزیں دُنیا میں ہیں۔ ان میں سے اُسے صرف اپنی بیوی سے

محبّت تھی۔ اس کا رینگتا ہُوا خُون اُس وقت گرم ہوتا تھا۔ جب وہ پاس ہوتی تھی۔ لیکن خدا کی شان جس قدر اُسے بیوی سے محبّت تھی اُسی قدر بیوی کو اس سے نفرت تھی۔ یہ بدشکل تھا وہ حسین تھی۔ یہ چرکین تھا۔ وہ نستعلیق وہ بہت کم اس کے پاس بیٹھتی تھی۔ وہ اپنی مرضی کی مختار تھی۔ جب چاہے گھر سے چلی جاتی اور جب چاہے واپس آ تی تھی۔ بارہا وہ گھر سے دو دو دن غائب رہتی تھی۔ اور شام چند کی مجال نہ تھی کہ اس سے جواب طلب کرے۔

ایک دن یکایک وہ اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی وہ حسب معمول جو گیا ساڑھی اُونچی ایڑی کی جُوتی اور پوڈر اور گلگونہ سے آراستہ و پیراستہ ہو کر بازاروں میں کانگریس کے گیت گانے اور انگریزی مال کے تاجروں کی دُکانوں پر پہرہ دینے ایسی گئی۔ کہ پھر واپس نہ آئی۔ تیسرے دن اُسے ایک وکیل کا جس نے اپنی زندگی بم سازوں۔ مفسدوں۔ ڈاکوؤں اور قاتلوں کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ جو ہمیشہ ان کی طرف سے بلا محنتانہ پیش ہوتا ہے اور اپنے زعم باطل میں اسے ملک کی بڑی خدمت سمجھ کر اس پر فخر کرتا ہے۔ ایک خط اس مضمون کا آیا۔ کہ تمہاری بیوی اب تمہارے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی۔ وہ عاقلہ اور بالغہ ہے۔ وہ تمہاری خصلت اور خو بو سے سخت متنفر ہے۔ اب وہ اپنی زندگی مُلک کی

آزادی کے لئے قربان کرنا چاہتی ہے +

(۳)

اِس خط نے زخم پر نمک کا کام کیا۔ یہ ایک زہر میں بجھا ہوا خنجر تھا۔ جو دستہ تک اس کے جگر میں غرق ہو گیا۔ خط پڑھ کر وہ چکرا گیا۔ مبہوت ہو گیا۔ وہ کھدر کے تھیلے میں ایک چھپا ہوا پتھر بن گیا دو گھنٹے کے بعد اس کے حواس بجا ہوئے۔ اور اصلیت اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اب اس کی قلب ماہیت ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک نیا انسان تھا۔ اب اس کے دل میں ایک نیا عزم جاگزین تھا۔ اب وہ ایک مستحکم مقصد قائم کر چکا تھا۔ بھگوتی پہلے بھی اس وکیل کے گھر آتی جاتی۔ اور اس کے مشورے پر کاربند ہوتی تھی۔ اب شام چند کا مقصد یہ تھا۔ کہ بانیٔ فساد وکیل کو قتل کیا جائے۔ وہ اُسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خوب جانتا تھا۔ کہ اس میں یہ ہمت۔ یہ جرأت یہ طاقت نہیں۔ اب آپ پوچھیں کہ کیا اُسے بھگوتی سے نفرت ہو گئی؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ بھگوتی کی روانگی سے شام چند کا ذلیل اور لغو جوش اور بھی بڑھ گیا۔ وہ دل سے چاہتا تھا۔ کہ بھگوتی واپس آ جائے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ اُسے آزار پہنچائے۔ اس کے تمام غصے اور عداوت کا رجوع وکیل کی طرف تھا۔ جس کے گھر میں اب بھگوتی سکونت پذیر تھی۔ وکیل کو قتل کیا جائے۔ وکیل کو قتل کیا جائے۔ جس طرح بھی ہو وکیل کو

مار ڈالا جائے"۔ یہ تھے الفاظ جو اس کے دماغ میں کروٹیں لیتے اور کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس کے کاہل اور غیر تربیت یافتہ دل میں درجنوں زہریلے منصوبے سانپوں کی طرح بل کھا رہے تھے۔ لیکن سب کے سب قابلِ عمل نہ تھے۔ وہ اِس وقت میلی کچیلی چوکی پر بیٹھا سوچ رہا تھا اُس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے۔ اور آنکھیں دیوار پر گڑی ہوئی تھیں۔ یکایک اُسے ایک تجویز سوجھی اور وہ اُچھل پڑا۔

(۴)

بھگوتی کے پیٹ سے جمنا نامی شام چند کی ایک بیٹی تھی۔ اس کی عمر اُس وقت گیارہ سال کی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ اور وہ اپنے کانٹوں کے بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ لیکن دل میں خوش تھا۔ کہ قسمت نے اس کے ہاتھ میں وہ ہتھیار دیدیا ہے۔ جس سے وہ انتقام لے سکے گا۔ وہ یہ قتل خود نہ کر سکتا تھا۔ اسے اتنا حوصلہ کہاں تھا۔ جس وقت وہ یہ کام خود کرنے کا ارادہ کرتا تھا۔ تو اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے تھے۔ اس میں مفسدی کے حامی وکیل کے ساتھ لڑنے کی ہمّت نہ تھی۔ اور جب وہ قاتلوں کے انجام اور پھانسی کے تختہ کا تصوّر کرتا تھا۔ تو روح فنا ہونے لگتی تھی۔ لیکن اب وہ خوش تھا۔ کہ اسے یہ فعل خود نہ کرنا ہوگا۔ اور ایک سیاہ قلب شرابی کے زیرِ اثر ایک معصومہ اس فعل کو اس طرح کرے گی جیسے ایک کل کہ جب اُسے

چابی دی جاتی ہے۔ تو وہ خود بخود چلنے لگتی ہے۔ وہ خوش تھا۔ کہ کام بھی ہو جائیگا۔ کوئی آفت بھی نہ آئیگی۔ اور مجرمہ معصومیت کے باعث قانون کے شکنجے سے نکل جائے گی ؎

(۵)

وہ حرکت جواب شام چند کرنے کو تھا۔ اگر کوئی اور کرتا اور شام چند سُنتا تو وہ بید مجنوں کی طرح کانپ جاتا۔ مگر وہ تو جوش انتقام میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اور اس شیطانی ولولے نے تمام آسمانی جذبات کو جن کی بدولت انسان کو اشرف المخلوقات کہلانے کا دعوےٰ ہے۔ معدوم کر دیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ مگر ابھی مندروں میں ناقوس گونج رہے تھے۔ وہ گھبرا کر چارپائی سے اُٹھا۔ اور اُس کمرے میں گیا جہاں خوبصورت جمنا جو اپنی گمراہ ماں کی تصویر تھی کھٹولے پر کمبل اوڑھے پڑی کوئی سپنا دیکھ رہی تھی۔ اور جیسا کہ بچوں کا دستور ہے نیند میں مُسکرا رہی تھی۔ یکایک ایک بیرحم ہاتھ نے معصومہ جمنا کے اُوپر سے کمبل بے دردی سے کھینچ لیا اور غریب لڑکی پر مُکّوں اور تھپڑوں کی بارش ہونے لگی۔ جمنا کے حلق سے ایسی آواز نکلی جیسے کوئی حالت نزع میں سانس لے رہا ہے۔ اور وہ حیران ہو کر جاگ اُٹھی۔ اس کے جاگتے ہی بیدرد اور سنگدل باپ اُسے بید سے پیٹنے لگا۔ ہر ضرب پر جو چیخ جمنا کے مُنہ سے نکلتی تھی۔ وہ پتھر کا جگر آب کرنے کو

کافی تھی مگر اس موذی پر کچھ اثر نہ ہوا پے در پے ضربات سے جمنا کی چیخیں اور التجائیں اور رحم کی درخواستیں سسکیوں میں بدل گئیں۔ اس پر بیہوشی سی طاری ہونے لگی اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اسوقت ضربات کی بارش تھم گئی۔ اور ایک بھاری اور بیٹھی ہوئی آواز اس کے قریب سے آئی۔ کیا تو جانتی ہے۔ کہ تو کیوں پٹ رہی ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ تیری ماں وکیل کے پاس چلی گئی ہے۔ اور کوئی نہیں رہا۔ کہ گھر سنبھالے اب کسی کو چاہیئے کہ وکیل کے گلے پر چھری پھیر دے۔ بس اب خاموش ہوکر سو جا۔ ورنہ کھال ادھیڑ دونگا"۔

(۶)

یہ کہہ کر شام چند اپنی کوٹھڑی میں واپس آیا۔ اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور مجروح جمنا بھی کھٹولی پر پڑ کر بڑی دیر تک روتی اور سسکیاں لیتی رہی۔ جب بڑی دیر کے بعد اسے نیند آئی جو انسانوں کو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ تو اس کے کانوں میں بے مہر باپ کے الفاظ "اب کسی کو چاہیئے کہ وکیل کے گلے پر چھری پھیر دے" گونج رہے تھے۔

(۷)

ایک دن اور گزر گیا۔ اور اس دن جب خلاف معمول شام چند بالارادہ دیر سے رات کو گھر آیا۔ تو گھر خالی تھا۔ اور جمنا غائب تھی۔ جاڑے کا

موسم تھا۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب جمنا گھر آئی۔ شام اس کے انتظار میں مکان کے صحن میں بیٹھا تھا۔ جمنا کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سُرخ تھا۔ سانس پھُولا ہوا تھا۔ جب اس نے صحن میں قدم رکھا۔ تو وہ گر پڑی۔ لیکن مار کے ڈر سے پھر اُٹھی اور باپ کو دیکھ کر بے اختیار اس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ اور گھبرا کر بولی "ابّا اب مجھے نہ مارنا۔ میں نے خود وہ وہ کام کیا ہے جسے کرتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے۔ میں نے چُپکے سے وکیل کے کمرے میں داخل ہو کر یُوں اس کے گلے پر چھُری پھیر دی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اور وہ پلنگ پر سویا ہُوا تھا۔ ابّا اب تو مجھے نہ مارو۔ اب وکیل مر گیا! ایک آجائیں گی"

(۸)

شام چند یہ سُن کر باغ باغ ہو گیا۔ اس کی باچھیں کھِل گئیں۔ قریب تھا کہ وہ خوشی سے اُچھل پڑے اور بلند آواز سے قہقہے لگائے مگر بصد مشکل اس نے اپنے آپ کو باز رکھا۔ اور صرف دکھاوے کے لئے خوف زدہ ہو کر کہا "مُردار تُو نے یہ کیا ظُلم کیا۔ اب کیا ہو گا" جمنا نے سادگی کے ساتھ خون آلودہ چھُری جو اس وقت تک اس نے بغل میں چھپا رکھی تھی نکال کر باپ کو دکھائی۔ اور کہا ابّا وہ میری ماں کو لے گیا تھا میں نے بہت اچھا کام کیا کہ اُسے مار ڈالا۔

اب شام چند نے دیکھا کہ جمنا کے ہاتھ اور اس کا کرتہ خون آلودہ ہیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ظاہرداری کے لئے گھر سے نکل کر بازار کی طرف دوڑا اور پولیس پولیس پکارنے لگا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ ایک سپاہی آ گیا۔ اُس نے سیٹی بجائی اور کئی کانسٹیبل آ دھمکے۔ چند کانسٹیبل وکیل کی کوٹھی کی طرف دوڑے۔ چند شام چند کے گھر میں داخل ہو کر باپ اور بیٹی دونوں کو گرفتار کر کے کوتوالی لے گئے۔

کوتوال کے روبرو شام چند نے اپنا بیان لکھواتے ہوئے کہا۔ مجھ سے بڑھ کر کوئی بدنصیب نہ ہوگا۔ ایک طرف تو بیوی نکل گئی۔ دوسری طرف معصوم بیٹی نے یہ ظلم کیا۔ اے پرمیشر میں کیا کروں۔ اس اثنا میں وہ سپاہی جو وکیل کی کوٹھی پر گئے تھے۔ واپس آ گئے۔ اور ان کی رپورٹ سن کر شام چند نے ایک نعرہ مارا۔ مگر اس کی آواز اس وقت ایک وحشی بھیڑیئے کی آواز تھی۔ جسے شکاری چاروں طرف سے گھیر کر زخمی کر دیتے ہیں اور اُسے بھاگنے کا راستہ نہیں ملتا۔ شام چند اب بال نوچ رہا۔ چھاتی پیٹ رہا اور مریض سرسام کی طرح ہذیان بک رہا تھا۔ رپورٹ یہ تھی کہ وکیل سلامت ہے۔ اور مقتولہ بھگوتی ہے۔ جو تاریک کمرے میں پلنگ پر سوئی ہوئی تھی۔ اگرچہ غدّار وکیل بچ گیا۔ اور مُفسدوں کی امداد پر کمربستہ ہے لیکن یتیموں کے شور و شیون بیواؤں کے بین۔ کسانوں کی فریاد۔ بیکاروں کی فغاں ایک دن رنگ لائیگی۔

چٹائی والا

(۱)

میاں امیر حسن ایک دولت مند تاجر تھے۔ سکینہ ان کی ماہ طلعت اکلوتی بیٹی تھی۔ اِس لئے وہ ماں باپ کی آنکھوں کا نُور اور دل کا سرور تھی میاں صاحب اپنی خوبصورت دختر کی حد سے زیادہ ناز برداری کرتے تھے۔ اور اس ناز برداری کی وجہ سے سکینہ یہی چاہتی تھی کہ کوئی بات اسکی مرضی کے خلاف نہ ہو وہ تعلیمیافتہ تھی۔ اخبار ہر روز پڑھتی تھی۔ اور اخباروں میں ان عورتوں کے خیالات نے جن کے دل میں یہ سما گیا ہے کہ اگر عورتیں مردوں سے افضل نہیں تو ان کے برابر ضرور ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ کیوں پولیس افسر۔ مجسٹریٹ۔ ممبر کونسل نہ ہوں۔ اُسے اپنا بنا رکھا تھا۔ اور وہ صالح والدین کی مرضی کے خلاف پردہ ترک کر چکی تھی۔ اتفاق سے ایک افغان مرد لڑکا جس کی عمر سولہ سال کی

تھی۔ ان کے ہاں چٹائی بنانے آیا۔ چراغ گل کی سیاہ آنکھیں۔ سیب کا سا رنگ اور الماس نما دانت سکینہ کو پسند آ گئے۔ اور اُس دن سے وُہ میاں صاحب کے ہاں آنے جانے لگا۔ جب وہ آتا تھا۔ تو سکینہ کو چاند چڑھ جاتا تھا ؛

(۲)

سکینہ جوان تھی اور اب وہ وقت تھا کہ اس کا بیاہ کیا جائے۔ میاں صاحب نے بڑی تلاش کے بعد ایک اُونچے گھرانے کا چراغ انتخاب کیا۔ مگر سکینہ کو تو اپنے چراغ کی لَو لگی ہوئی تھی۔ والدین کا انتظام اُسے پسند نہ آیا۔ بہت بگڑی بہت جھلائی اور صاف صاف مُنہ چڑھ کے کہہ دیا۔ کہ سنو امّاں جان اور ابّا جان میری عُمر اب اٹھارہ سال سے اُوپر ہے اور میں خود مختار ہوں۔ آپ کو کوئی حق حاصل نہیں۔ کہ اس معاملہ میں دخل دیں میں اپنا شوہر خود پسند کروں گی۔ یہ سُن کر میاں صاحب سُن ہو گئے اور گھبرا کر کہا بیٹی تُم کیا کہہ رہی ہو میں تُمہارا دشمن نہیں۔ تُم کم عُمر نا تجربہ کار لڑکی ہو تمہاری عقل خام ہے۔ اور میں جہاں دیدہ ہوں۔ میں تمہاری بھلائی سوچ رہا ہوں۔ اگر تمہیں میرا انتخاب پسند نہیں تو مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔ اس کا جواب سکینہ نے پہلے تو کچھ نہ دیا۔ آخر باپ کے مجبور کرنے پر کہہ ہی دیا۔ کہ میں شادی چراغ گل کے ساتھ کروں گی ورنہ نہیں کروں گی؛

(۴)

یہ جواب سُن کر میاں صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ اور پریشان ہو کر بولے کہ سکینہ یہ کیا کہہ رہی ہے کہاں تم ایک خاندانی امیرزادی اور کہاں وہ اجڈ اور جاہل پٹھان۔ لوگ کیا کہیں گے۔ خدا کے لئے یہ خیال خام دماغ سے دُور کردو اور مجھے اور اپنے آپ کو رُسوا نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ اکثر یہ نیم وحشی سرحدی پٹھان ایک قسم کے حیوان ہوتے ہیں۔ جب ان کے سر پر بھوت سوار ہو جاتا ہے تو پھر کسی کے نہیں بنتے۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ تمہارے لئے مَیں نے بہت اچھا بر تلاش کیا ہے۔ وہ ہر طرح تمہارے لائق ہے۔ خوبصورت ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ امیرزادہ ہے ہم سے بڑھ کر دولت مند ہے۔ ایسا رشتہ ہاتھ سے نہ گنواؤ ورنہ پچھتاؤ گی۔ خطا کھاؤ گی۔ مَیں تو تم کو بہت سمجھدار سمجھتا تھا۔ تمہاری عقل کہاں گئی۔ توبہ توبہ کہاں تم اور کہاں وہ نالائق چٹائی والا÷

(۵)

فارسی زبان میں مثل ہے ۔ نصیحت صیقلِ زنگارِ عشق است۔ میاں صاحب نے بیٹی کو بہت سمجھایا۔ اُونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ مگر باپ کی نصیحت آگ کے لئے تیل ثابت ہوئی۔ آتش شوق اور بھڑک گئی۔ اور اس نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بیٹی کے متواتر انکار اور اصرار سے آخر میاں صاحب کو

غصہ آگیا۔ آج تک انہوں نے بیٹی کو کبھی نگاہ گرم سے بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اس وقت سکینہ کی ہٹ انہیں بُری معلوم ہوئی۔ اور بگڑ کر کہا۔ سکینہ بے شک تم بالغ ہو خود مختار ہو۔ مگر ماں باپ کا بھی کچھ حق ہے ان کے احسان تمہیں فراموش نہ کرنے چاہئیں کہیں ایسا نہ ہو کہ تم باپ کے ورثہ سے محروم ہو جاؤ۔ اور یہ بہت بڑی جائیداد جس کی تم واحد مالک ہو گی تم سے چھن جائے۔ سکینہ نے جواب دیا آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کی جائداد آپ کو مبارک رہے۔ میں آپ کی شکرگزار ہوں۔ کہ آپ نے مجھے شاہزادیوں کی طرح پالا لیکن محبّت اندھی ہے۔ میں مجبور ہوں۔ آپ میرے بزرگ ہیں قبلہ و کعبہ۔ راز دل آپ کے سامنے بیان کرنا میرے لئے شرم کا باعث ہے۔ اور آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں مجھے جو چاہو کہو۔ بے شرم کہو۔ آزاد کہو۔ شوخ دیدہ کہو۔ لیکن میرا آخری جواب وہی ہے جو عرض کر چکی ہوں میری آنکھوں میں چراغ گل جسے آپ حقارت سے چٹائی والا کہتے ہیں۔ یوسف ثانی ہے۔ شہزادہ ہے۔ فرشتہ ہے۔ بیٹی کا یہ جواب سُن کر میاں صاحب کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور یہ کہہ کر کہ توبہ توبہ کس قدر بے شرم و بے حیا ہے۔ ایسی اولاد تو دشمن کے گھر بھی نہ ہو۔ وہاں سے چلے گئے +

(۵)

صبح کا سہانا سماں تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے عطر بیز جھونکے عالم اسباب کا دماغ معطر کر رہے تھے۔ مرغان خوش الحان دلنواز نغموں سے ہوا میں جان ڈال رہے تھے۔ اور سکینہ موٹر سے اتر کر چراغ گل کے انتظار میں جس کا آنا میاں صاحب نے اپنے گھر میں مسدود کر دیا تھا۔ گول باغ میں کھڑی تھی۔ کہ ایک طرف سے ایک خوش پوش۔ خوش رو نوجوان غزال رعنا کی طرح نمودار ہوا اور سکینہ کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

سکینہ "آپ کون صاحب ہیں میں نے آپ کو نہیں پہچانا"۔

نوجوان "میرا نام بدر عالم ہے اور میں نواب خورشید عالم کا فرزند ہوں اور جناب میاں صاحب کی اجازت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"۔

یہ سن کر سکینہ کی تیوری پر بل پڑ گیا اور وہ سمجھ گئی کہ یہ وہی شاندار امیر زادہ ہے جس سے اس کا باپ اسے بیاہنا چاہتا ہے۔

سکینہ "پھر مجھ سے کیا کام ہے۔ میں آپ کو نہیں جانتی آپ مجھے نہیں جانتے یہ بلا تعارف منہ اٹھائے آ جانا اور کسی شریف زادی کو مخاطب کرنا سراسر خلاف تہذیب ہے"۔

نوجوان "آپ بجا فرماتی ہیں اور میں اپنی جسارت پر نادم ہوں۔ مگر یقین

جانئے کہ میں نے یہ جرأت آپ کے والد بزرگوار کی اجازت سے کی ہے"۔

سکینہ:- "وہ بھی مجاز نہیں کہ ایک نامحرم کو میرے پاس آنے کی اجازت دیں"۔

نوجوان:- "میں معافی کا خواستگار ہوں"۔

سکینہ:- "کہئے کیا مطلب ہے"۔

نوجوان:- "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ تعلیمیافتہ - روشن دماغ، موجودہ تہذیب اور نئی روشنی سے منور خاتون ہیں - آپ کی رائے یہ ہے - کہ نکاح اور شادی کا سوال خود عورت کو حل کرنا چاہیئے ......"

سکینہ:- "آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں میں اس قسم کی گفتگو سننے کے لئے تیار نہیں - جائیے تشریف لے جائیے - اگر پھر کبھی آپ میرے روبرو آئے تو اچھا نہ ہوگا"۔

یہ سن کر بدر عالم پژمردہ دل اور آشفتہ خاطر ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

(۶)

صبح کا وقت تھا اور میاں امیر حسن تاجر اپنی عالیشان حویلی کے ایک پر تکلف کمرے میں بیٹھے چائے نوش فرما رہے تھے - ان کی اہلیہ محترمہ یعنی سکینہ کی والدہ ماجدہ ان کے قریب بیٹھی تھیں - اور سکینہ کا ذکر ہو رہا تھا۔

میاں:- "سکینہ کی والدہ میں حیران ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے - ہم لوگوں کو

پُرانے زمانے کے احمق کہا جاتا ہے۔ لیکن جدھر دیکھو بیحیائی کا بازار گرم ہے۔ لڑکیاں اپنے خاوند آپ تلاش کرتی ہیں۔ ماں باپ کے مشورے کو مداخلت بے جا کہا جاتا ہے۔ حجاب کا نام قید بے زنجیر رکھ دیا ہے۔ عورتیں اپنے آپ کو مردوں سے افضل سمجھتی ہیں۔ اور چاہتی ہیں۔ کہ بازاروں میں شور مچائیں۔ وکالت کر کے روزی کمائیں۔ میونسپل کمیٹیوں اور کونسلوں میں بیٹھ کر تالیاں بجائیں اور رنج کشی کریں۔ اگر گھر برباد ہو رہا ہے اگر اولاد آوارہ ہو رہی ہے۔ اگر خاوند کو آرام میسّر نہیں تو ان کی بلا سے۔ اس کی انہیں پروا نہیں ہونی چاہیئے۔ خدا رحم کرے عجیب وقت آگیا ہے"۔

بیوی:۔ آج کل کے حالات دیکھ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں تو عورت کا پہلا فرض یہ تھا۔ کہ گھر کا انتظام کرے اولاد کی تربیت کا بیڑا اُٹھائے۔ خاوند سے محبّت کرے اس کی اطاعت کرے ہر طرح کا آرام دے اور اس کی پریشانیوں کو کم کرے اس کی مصیبتوں میں شریک ہو۔ اور اس کی زندگی کو جنّت بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے"۔

خاوند۔ اور اب عورتیں یہ چاہتی ہیں کہ اولاد بھاڑ میں جاوے اور خاوند غُلام بن کر روپے کمائے نقلی ہیروں کے زیور اور زرق برق ساڑیاں

اُن کے لئے لائے۔ اور وہ بن سنور کر۔ بازاروں۔ سیرگاہوں اور سنیماؤں میں اپنی آرائش کی نمائش کریں۔ افسوس ہے۔ کہ تمہاری سکینہ سکینہ کے خیالات بھی اسی قسم کے ہیں۔ اس کے عنوان مجھے اچھے دکھائی نہیں دیتے۔ اگر چراغ لے کر ڈھونڈو تو بدر عالم جیسا داماد تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔ خدا جانے اس کمبخت لڑکی کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ جس قدر بدر عالم کو اُس سے رغبت ہے۔ اسی قدر سکینہ کو اس سے نفرت ہے"۔

بیوی "آگ لگے اس موئے پٹھان کو وہ تو اسی کا کلمہ پڑھتی ہے"۔

میاں۔ "اور آگ لگے اُس منحوس گھڑی کو جب اس چٹائی والے کا قدم ہمارے گھر میں آیا۔ سچ پوچھو تو ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہمارے بے جا لاڈ پیار اور نامناسب ناز برداری نے یہ روز سیاہ دکھایا۔ والدین آنکھیں بند کر کے اولاد کو آزادی دے دیتے ہیں۔ اگر کوئی خرابی دیکھیں تو شروع شروع میں روک تھام نہیں کرتے۔ اور جب طوفان برپا ہو جاتا ہے تو خواب خرگوش سے بیدار ہوتے ہیں۔ اور وہ آخر ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

بیوی۔ اللہ رحم کرے۔

(۷)

جب سکینہ کی تُرش روئی سے آزردہ خاطر ہو کر بدر عالم اس سے جُدا ہُوا تو چراغ گل ظاہر ہُوا۔ اُس نے دُور سے آتے ہوئے بدر عالم کو سکینہ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس وجہ سے آگ بھبو کا ہو رہا تھا۔ سکینہ نے دیکھا کہ اس کا چہرہ تمتما رہا ہے اور آنکھیں خُون کبوتر کی طرح سُرخ ہیں۔

سکینہ۔ "خیر تو ہے آج تم ۔۔۔۔"

چراغ۔ (دانت پیس کر) یہ کون تھا جس سے تو باتیں کر رہی تھی"۔

سکینہ۔ "یہی تو وہ نواب زادہ ہے جس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں"۔

چراغ۔ "اواُس کے پدر پر لعنت۔ مَیں اسے قتل کردوں گا"۔

سکینہ۔ "نہیں نہیں ۔۔۔۔۔"

چراغ۔ "مَیں اسے اور تیرے باپ دونوں کو قتل کروں گا"۔

سکینہ۔ "پیارے چراغ گل تم پریشان نہ ہو۔ مَیں تمہاری اور صرف تمہاری ہوں۔ اور مجھے دُنیا میں کوئی طاقت تم سے جدا نہیں کر سکتی"۔

چراغ۔ "دیکھو جی یہ بھڑے کسی اَور کو دو۔ تم مجھ سے دغا کرو گی۔ تو اچھا نہ ہوگا۔ دیکھو جی میرا باپ بیمار ہے۔ اور مَیں وطن جانا چاہتا ہوں"۔

سکینہ۔ (زرد ہو کر) نہیں نہیں۔ مَیں نہیں جانے دوں گی"۔

چراغ: "یہ نہیں ہو سکتا"۔

سکینہ: "پیارے گل میری زندگی تم سے ہے۔ مَیں تُم سے کسی طرح جُدا نہیں ہو سکتی اگر تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو مَیں مر جاؤں گی"۔

چراغ: "نہیں نہیں مجھے جانا ضرور ہے۔ مَیں چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا"

سکینہ (رو کر) "تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو"۔

(۸)

چار دن گُزر گئے۔ میاں امیر حسن کے مکان میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ مامائیں سراسیمہ ہیں۔ مہریاں تصویرِ حیرت بنی ہوئی ہیں۔ میاں صاحب کی اہلیہ رو رہی ہیں اور میاں صاحب کا تو یہ حال ہے کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ چند گھنٹوں میں اِس قدر بدل گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔ اُن کے بال جو کھچڑی تھے یک قلم سفید ہو گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جیسے سال بھر سے بیمار چلے آتے ہیں۔ اِس پریشانی۔ حیرانی اور افراتفری کی وجہ یہ ہے کہ سکینہ رات سے غائب ہے۔ وہ کہیں چلی گئی اور جاتے وقت اپنی زیور کی صندوقچی ہمراہ لے گئی ہے۔ میاں صاحب کے خدام با ادب جو اسے ڈھونڈنے اس کی سہیلیوں کے ہاں گئے تھے۔ واپس آ گئے ہیں اور خبر لائے ہیں کہ وہ ان کے ہاں نہیں۔ خُفیہ تحقیقات سے معلوم ہُوا ہے کہ چراغ گُل چٹائی والا تین دن سے دُکان پر نہیں آیا۔ اور وُہ بھی شہر سے غائب ہے۔ میاں صاحب کی کوشش

کہ پردہ فاش نہ ہو کارگر ثابت نہ ہوئی۔ یہ وحشت اثر خبر طشت از بام ہو چکی ہے۔ اخباروں میں اس کا چرچا ہونے کو ہے۔ دشمن ملک اخبار نویسوں کی چاندی ہے۔ وہ اصلیت کو چھپانے کے لئے چاہتے ہیں۔ کہ ان کی مٹھی گرمائی جائے اور استحصال بالجبر کا مکروہ آلہ استعمال کر رہے ہیں۔ گمراہ لڑکی کے والدین کی جان بدنامی سے عذاب میں ہے! اور زندگی دوبھر ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض انسان بیٹی کی پیدائش پر مغموم ہو جاتے ہیں اور بعض تو یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ بیٹی دشمن کے گھر میں بھی نہ ہو ٭

(۹)

دو سال گزر گئے۔ سکینہ سرحدی قبائل کے ایک گاؤں میں اپنے شوہر چراغ گل کے ساتھ رہتی ہے۔ اور تمام وہ کام جو دیہاتی غریب گھروں میں عورتوں کو کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے ذمے ہیں۔ وہ چکی پیستی ہے۔ روٹی پکاتی ہے۔ جھاڑو دیتی ہے۔ گوبر تھاپتی ہے۔ اس کے نازک ہاتھوں پر محنت اور مشقت سے گٹے پڑ گئے ہیں۔ حسن کی دوپہر ڈھل گئی ہے۔ گلنار چہرہ زرد ہے لباس میلا اور کثیف پہنتی ہے۔ اور جب پھٹ جائے تو خود سیتی ہے۔ وہ جوش جس نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔ زائل ہو چکا ہے۔ اسے ماں باپ یاد آتے ہیں اور انہیں یاد کر کے روتی ہے۔

اس کا کنبہ اِس پر اس طرح حکومت کرتا ہے کہ گویا وہ زرخرید لونڈی ہے۔ اب اس کے بہائم صفت خاوند کی صُورت شکل بھی وہ نہیں رہی جس نے صحرائے زندگی میں سراب کی طرح اُسے تباہ و برباد کر دیا۔ وہ چاہتی ہے کہ کسی طرح اس جہنم سے نکلے۔ مگر قفس لوہے کا ہے اور بُلبل اسیر کی رہائی ناممکن ہے ۔

سکینہ کو والدین سے جدا ہوئے اڑھائی سال ہو چکے ہیں۔ اب چھ ماہ کا بچہ اس کی گود میں ہے وہ اِس وقت چُولہے کے سامنے اُداس بیٹھی ہے کہ چراغ گُل عفریت کی طرح بکتا جھکتا آتا ہے اور کڑک کر کہتا ہے آج تو حضرت نُور کے ساتھ ہنس ہنس کر کیوں باتیں کر رہی تھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ سکینہ یہ سُن کر روتی ہے اور اپنی براءت میں کچھ کہنا چاہتی ہے کہ چراغ گُل طیش میں آکر اپنے افغانی چھُرے سے اس کے پستان قلم کر دیتا ہے ۔

جواری کی موت

(۱)

مَیں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب ڈاکٹر لیٹنر کالج کا پرنسپل تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا دماغ نُور کا گولہ تھا۔ اِس دل اور دماغ کے انسان بہت کم دُنیا میں آتے ہیں۔ یُونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہ تھی۔ جو ہمارے پرنسپل کے نام کے ساتھ طرّۂ امتیاز نہ تھی۔ وہ ایم۔اے تھا۔ پی۔ایچ۔ڈی تھا۔ ایل۔ایل ڈی تھا۔ ڈی۔سی ایل تھا۔ ڈی۔او۔ایل تھا۔ بیرسٹرایٹ لا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں پنجاب کا محسن تھا۔ پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج اُس کی مساعیٔ جمیلہ کا ظہور ہیں۔ وہ بات جس کے لئے اب غل مچایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اُسی کو سُوجھی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ یورپی علوم و فنون ہندوستانی زبان کی وساطت سے بڑھائے جائیں۔ افسوس ہندوستانیوں کی سمجھ میں اس کی

بات نہ آئی - کیا انگریز کیا ہندوستانی سب نے اس کی تردید مخالفت کی - اور اُس کی تجویز کو مصنوعی مشرقیت یعنی شیم اوری اینٹل ازم کے نام سے منسوب کیا - اور جیسے باز کے گرد کوّے جمع ہو کر کائیں کائیں کرتے ہیں - اور وہ بیچارہ گھبرا کر راہ فرار اختیار کرتا ہے - اُس وقت خاموش ہوئے - جب وہ سچا مُحسن دل شکستہ ہو کر یہاں سے رخصت ہو گیا - کچھ عجب شانِ پروردگار ہے - کہ اب ہمدرد اور خلیق انگریز بہت کم ہندوستان میں آتے ہیں - انگلستان! انگلستان!! کیا مسٹر براڈ رتھ - کرنل مارشل - اور لارڈ رپن جیسے انگریز کہیں نہیں ملتے - جو میٹھی زبان سے ہندوستانیوں کو حلقہ بگوش کر لیتے تھے میں سچ کہتا ہوں - اور ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ سلطنت برطانیہ کے بڑے دشمن وہ انگریز ہیں - جو ہمدردی سے محرومِ ہیں - جو فرعونیت و انانیت کو فخر سمجھتے - اور اس مُلک کے باشندوں سے اخلاق و مسرّت کے ساتھ پیش آنا کسرِ شان خیال کرتے ہیں - غضب تو یہ ہے کہ اُن لوگوں سے بھی کج خلقی کرتے ہیں - جو تاج برطانیہ کے جاں نثار ہیں - شوقِ وفا میں بم سازوں اور فتنہ پردازوں کے مقابلے میں سینہ سپر رہتے ہیں - اور اپنے بادشاہ کی خدمت میں سر کو ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں - خدا کا شکر ہے کہ ایسے انگریز کم ہیں - ورنہ بڑی مشکل ہوتی - خدا کا شُکر ہے کہ ایسے انگریز اب بھی ہندوستان میں موجود

ہیں۔ جو درخت وفا کو سیراب کر رہے ہیں۔ اور اس کے سبز پتوں کو مرجھانے نہیں دیتے ؎

(۲)

مَیں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔ اموِلک رام میرا ہم جماعت اور دوست تھا وہ ہندو تھا اور مَیں مسلمان۔ مگر ہمارے دِل آلائش تعصّب سے پاک تھے۔ اس وقت ایسے اخبار موجود نہ تھے جو گورنمنٹ کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ جو مفسدوں۔ ڈاکوؤں اور فتنہ پردازوں کو لیڈر بنا رہے ہیں۔ جو قاتلوں کو محسنِ ملک قرار دے کر ان کی تصویریں چھاپتے اور برسی مناتے ہیں۔ اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کو امن کا شیرازہ بکھیر رہے ہیں۔ ہندوستان کے رہنے والو! ایسے اخباروں سے بھاگو۔ یہ زہر ہیں۔ سنکھیا ہیں۔ آتش خیز پہاڑ ہیں۔ قحط ہیں۔ زلزلہ ہیں۔ وبا ہیں۔ یہ تم کو بغاوت اور نمکحرامی کا سبق پڑھاتے ہیں ؎

(۳)

مَیں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔ اموِلک رام میرا پیارا دوست تھا۔ ہم دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے۔ اموِلک رام کا باپ رسالدار میجر تھا۔ اور سلطنت انگلشیہ کا وفادار سپاہی مشہور تھا کہ جنگِ کابل میں

اُسے بہت سے جواہرات ہاتھ آگئے تھے۔ اس لئے امیر کبیر تھا۔ ابھی ہم سیکنڈ ایر میں تھے۔ کہ باپ کے رسوخ سے اموک کو براہ راست کمیشن مل گیا۔ اموک جامہ زیب اور خوشرو جوان تھا۔ جب وہ طلاکار سُرخ وردی پہن کر آخری مرتبہ ہم سے رخصت ہونے کو کالج میں آیا۔ تو اس کا جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ وہ بلا مبالغہ سپاہی یا سپہ سالار نظر آرہا تھا۔ ہُوبہُو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چودھویں رات کے چاند نے آسمان حُسن سے پردۂ زمین پر نزول فرمایا ہے۔ وقتِ رخصت اموک نے سب سے ہاتھ ملایا۔ اور مجھ سے بغلگیر ہُوا۔ اس وقت مجھے یاد ہے کہ میرے دل میں درد اُٹھا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

(۴)

دس سال گزر گئے۔ اِس عرصے میں مجھے نہ تو اموک کا خط آیا۔ اور نہ اس سے ملاقات ہوئی۔ اِس عرصہ میں مَیں نے کالج کی پڑھائی ختم کرلی۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور وکالت کا ڈپلوما لے کر وکالت کرنے لگا۔ مگر افسوس کہ میری وکالت نہ چمکی۔ وجہ یہ تھی۔ کہ مَیں محنتی اور جفاکش نہ تھا۔ میرے والدین غریب تھے۔ مَیں ایمان کو آنکھ کا تارا سمجھتا تھا۔ جھوٹ سے کانپتا تھا۔ گواہوں کو سکھانا پڑھانا مجھے موت نظر آتا تھا۔ حُکام کی خوشامد سے چڑاتا تھا۔ دلالوں سے کوئی تعلق

رہتا تھا۔ اور اتنی استطاعت نہ تھی۔ کہ ہر قسم کی قانونی کتابیں خریدتا۔ جو ہر وکیل کے لئے ایسی ضروری ہیں۔ جیسے جنگ کے لئے آبدوز کشتیاں۔ سیال آگ۔ زہریلی گیس۔ تارپیڈو اور مشین سے چلنے والی توپیں ٭

(۵)

میری وکالت نہ چلی۔ میری آمدنی سو روپے ماہوار سے زیادہ نہ بڑھی۔ اور میں شادی بھی نہ کر سکا۔ بے عیب خدا کی ذات ہے۔ میں ہر طرح نیک چلن تھا۔ لیکن ہر روز شام کو لوگوں کی نظر بچا کر سیٹھ اڈل جی کی دُکان پر ضرور جاتا۔ اور ایک پیگ شراب کا ضرور لیتا تھا جس سے مجھے ایک قسم کا سرور اور میرا غم غلط ہو جاتا تھا۔ ایک شام کو حسبِ معمول میں میز کے آگے کرسی پر بیٹھا وسکی کے گلاس میں برف ڈال رہا تھا کہ ایک اجنبی سیٹھ صاحب کی دُکان میں وارد ہوا۔ اس کا لباس میلا کچیلا اور رنگ زرد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدّت تک بیمار رہ چکا ہے۔ اجنبی میرے قریب بیٹھ گیا۔ اور برانڈی مانگی اور میرے دیکھتے دیکھتے ایک بڑا ٹمبلر لاجرعہ پی گیا۔ جونہیں شراب حلق سے نیچے گئی۔ اس کی حالت بہتر ہو گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اُس کا گھورنا بہت ناگوار گزرا۔ اور

میں نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ انسان لباس نہ ہو تو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ اجنبی کی حالت بظاہر سقیم تھی اس کا لباس کہنہ اور میلا تھا۔ اور مجھے اس سے گھن آ رہی تھی۔ یکایک وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور گرمجوشی سے میری طرف بڑھا اور پکارا "نیاز کیا تم اپنے دوست اموک کو بھول گئے"؟ اموک کا نام سُن کر میں چونکتا ہُوا۔ اور اسے پہچانا وہ واقعی اموک تھا۔ مگر اس قدر بدل گیا تھا کہ اگر وہ مُنہ سے نہ بولتا تو شناخت ناممکن تھی۔ دس سال کی مفارقت سے محبّت کا جوش سرد پڑ چکا تھا اور پھر اموک کی حالت سے ناداری آشکارا تھی۔ اگر وہ اس وقت لباس فاخرہ میں نمودار ہوتا تو میں دوڑ کر اُسے لپٹ جاتا۔ اب سرد مہری سے ہاتھ ملایا اور کہا "کیا تم اموک ہو۔ یار تمہارا کیا حال ہے۔ تمہارے والد کی دولت کیا ہوئی۔ اور کیا تم نے فوجی ملازمت ترک کر دی"؟

(۶)

اموک نے مجھے اپنا قصّہ سُنایا۔ کہ رسالدار صاحب واقعی بڑے دولت مند تھے مگر پنشن لے کر انہوں نے اپنا تمام روپیہ بیوپار میں لگا رکھا تھا جس میں اُنہیں سخت گھاٹا پڑا۔ اور بنک کا دیوالہ نکل جانے سے وہ قلاش ہو گئے اگر پنشن نہ ہوتی تو محتاج ہو گئے تھے۔ اس بربادی سے

ان کی صحت بگڑ گئی اور بہت جلد اِس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے"۔
میں نے ہمدردی کے لہجہ میں بہت افسوس کیا۔ اور پوچھا کہ تم نے نوکری کیوں چھوڑی تو اُس نے جواب دیا کہ میرا افسر بدلگام تھا۔ اس نے مجھے گالی دی۔ مَیں برداشت نہ کر سکا۔ مجھ سے گستاخی ہو گئی۔ کورٹ مارشل نے مجھے قصوروار ٹھہرایا اور مَیں برخاست کر دیا گیا! افسوس کہ تمام آرزوئیں خاک ہو گئیں اور اب یہ حال ہے جو تم دیکھ رہے ہو یکایک پُرانی محبت کا شعلہ چمک اُٹھا اور ہم شیر وشکر ہو گئے۔ مَیں نے شیمپین شراب کی ایک بوتل اس کے لئے منگوائی۔ اور جب ہم شراب خانے سے نکلے تو دونوں سرشار تھے"۔

(۷)

صبح جب میری آنکھ کھُلی تو سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ رات کی بے اعتدالی سے میری جیب خالی اور طبیعت سخت بدمزہ تھی۔ میری جیب میں ایک سَو روپے کا نوٹ تھا یہ میری سال بھر کی کمائی تھی اس کی جگہ اس وقت ایک یادداشت قرضہ تھی۔ جس کی رُو سے اموک نے مجھ سے سَو روپے قرض لئے تھے۔ مَیں اِس حماقت پر پریشان ہو رہا تھا کہ اموک میرے کمرے میں آیا۔ اور بولا "بھائی نیاز تم نے مجھے بچا لیا۔ تمہارے سَو روپے کے نوٹ سے ایک رات میں مَیں نے پانچ ہزار

روپے کمائے یہ لیجئے اپنے سو روپے اور اُس کے ساتھ دو سو روپے میری طرف سے۔" میں نے حیران ہو کر تین سو روپے کے نوٹ لے لئے اور سمجھ گیا کہ امولک نہ صرف وھاوت شرابی ہے بلکہ کال جواری بھی ہے

(۸)

اس دن سے امولک پر مہارانی لچھمی دولت کی دیوی مہربان ہو گئی وہ ہر رات لاہور کے مشہور قمار خانہ میں جُوا کھیلتا اور جیتتا تھا۔ اب اس کا ٹھاٹھ امیرانہ تھا۔ اعلےٰ قسم کا انگریزی دُکان کا سوٹ زیب تن کرتا۔ قیمتی سگار پیتا۔ فٹن پر ہوا خوری کو جاتا تھا۔ وہ ایک مشہور ہوٹل میں فروکش تھا۔ اور سو روپے ماہوار پر ایک رقاصہ گانا سُنانے اور دل بہلانے کو مامور تھی۔ اِس شاہانہ خرچ کے آگے گنج قارون بھی بے حقیقت تھا۔ قمار بازی کی کمائی بھلا کس شمار میں تھی۔ آخر وہی ہُوا جس کا اندیشہ تھا۔

(۹)

امولک کی بڑی دوستی ایک بیرسٹر اور ایک حکیم سے تھی۔ بیرسٹر بڑا عیّار اور حکیم پرلے درجے کا مکّار تھا۔ اِس لئے دونوں اشرفیوں سے کھیلتے تھے۔ امولک کی وجہ سے میری بھی ان کی مجلس میں رسائی ہو چکی تھی ہفتہ میں ایک بار ہم باری باری سے بیرسٹر اور حکیم کے

ہاں جمع ہوتے کھانا کھاتے اور ارغوانی شراب کے جام لنڈھاتے تھے۔
ایک دن بیرسٹر کے مکان میں ہم حسب معمول جمع ہوئے مگر اموولک نہ آیا۔ بیرسٹر نے کہا۔ چند دن سے میں امو ولک کو بہت رنجیدہ اور ملول دیکھتا ہوں۔ کچھ دال میں کالا ضرور ہے ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ امو ولک آ گیا واقعی اُس کا چہرہ بہت مکدر تھا۔ ہر چند دسترخوان پر کئی قسم کی نعمتیں موجود تھیں مگر اُس نے بمشکل چاولوں کے چند دانے کھائے البتہ بلا تامل شیمپین کی دو بوتلیں چڑھا گیا۔ اتّفاق سے اُس دن ہم سب بہت پی گئے۔ نشے میں حکیم نے بیرسٹر کو گالی دی۔ جس سے اُسے غصہ آ گیا۔ اور اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جس پر حکیم نے سوڈے کی بھری ہوئی بوتل اُٹھا کر بیرسٹر کی طرف پھینکی بھلے کو نشانہ خطا گیا ورنہ چیف کورٹ کی فہرست سے ایک نامور ایڈووکیٹ کا نام خارج ہو گیا تھا۔ بوتل دیوار سے لگی اور بڑی آواز سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ بیرسٹر نے آگ ہو کر پستول نکالا۔ جو امو ولک نے بصد مشکل اس کے ہاتھ سے لے کر جیب میں رکھ لیا۔

(۱۰)

صبح میں بہت دیر سے جاگا۔ جب پلنگ سے اُٹھا۔ تو بیرسٹر کی گاڑی میرے مکان کے آگے ٹھہری۔ بیرسٹر نے مجھے آواز دی۔ میں گھبرا گیا اور

میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں جلد جلد کپڑے پہن کر باہر نکلا۔ اس نے مجھے گاڑی میں بٹھا لیا۔ اور کہا میرا پستول امولک کے پاس ہے۔ ہم دونوں وہاں گئے۔ جہاں امولک مقیم تھا۔ فرسٹ کلاس کا کمرہ جو امولک کا گھر تھا۔ بند تھا۔ مینیجر نے ہمیں بتایا کہ مالی مشکلات کی وجہ سے مسٹر امولک نے یہ کمرہ چھوڑ کر ایک تھرڈ کلاس معمولی کمرہ ایک ہفتہ سے لے رکھا ہے۔ وہ ہمیں اس طرف لے گیا۔ امولک کا کمرہ افیونیوں کی آنکھ کی طرح بند تھا۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا آوازیں دیں۔ مگر صدائے برنخاست۔ ناچار لوہار بلوا کر دروازہ کھلوایا گیا۔ تو امولک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اور بیرسٹر کا پستول اُس کے سر کے قریب پڑا تھا۔ بائیں کنپٹی میں گولی کا سوراخ تھا جس سے خون بہہ کر چارپائی پر خون کا تالاب لگا ہوا تھا۔ یہ حال دیکھ کر مجھے اور بیرسٹر کو سکتہ ہو گیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس والے آ گئے اور امولک کی نعش ہسپتال لے گئے۔ جہاں سے وہ میڈیکل کالج کے طلبہ کو چیرنے پھاڑنے کے لئے مل گئی۔ کیونکہ لاوارث تھی۔ یہ تھی جواری کی موت ؎

ایک عجیب موٗکل کی کہانی پیرمرد کی زبانی

(۱)

پیرمرد نے کہا کہ یہ نہ پوچھو کہ اِس قصّہ کے واقعات مجھے کیسے اور کہاں سے معلوم ہوئے بس یہ سمجھ لو کہ کچھ تو میرے چشم دید ہیں اور کچھ مجھے معلوم ہیں اور بالکل درست ہیں بیشک مدّت گزر چکی ہے مگر اب بھی چند اشخاص زندہ ہیں۔ جو ان کی تصدیق کر سکتے ہیں"

"سینٹ جارج کے گرجا کے قریب اُس بازار میں جسے بروٗ سٹریٹ کہتے ہیں۔ عدالت ہائے دیوانی کے قیدیوں کا سب سے چھوٹا قیدخانہ واقع ہے۔ جو مارشل سی کے نام سے مشہور ہے۔ گذشتہ ایّام میں اِس جیل کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ قیدخانہ کیا تھا۔ ایک مزبلہ تھا۔ ایک سنڈاس تھا۔ اب بھی میرے خیال میں ایک قسم کا دوزخ ہے۔ گو اگلی سی حالت نہیں ہے+

یہ بازار بیشک وسیع ہے۔اس کی دکانیں فراخ ہیں۔ صبح سے لے کر آدھی رات تک یہاں گاڑیاں دوڑتی ہیں۔ لوگوں کے قدوم کا سمندر برابر بہتا رہتا ہے۔ ساز و سامان کی جھنکار اور لین دین کی پکار کسی وقت بند نہیں ہوتی۔ لیکن اس بازار کی آس پاس کی گلیاں تنگ اور تاریک اور غلیظ ہیں۔ ان گلیوں میں بھنگی اور صفائی کا گزر نہیں۔ البتہ مفلسی اور عیاشی آباد ہے۔ اور پھر اس قید خانہ کی تاریکی۔ اداسی اور محتاجی۔ جسے یہاں کی آب و ہوا کہنا چاہیئے۔ عذاب جان۔ اب بھی میں جب کبھی ادھر سے گزرتا ہوں تو میری حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ کئی مدیون اور دیوالئے جن کی آنکھیں اب کنج مرقد میں بند ہیں۔ جب یہاں کے حالات سے بیخبر تندرست اور چاق و چوبند یہاں آتے تھے تو ان کے دلوں میں اس امید کی جھلک ہوتی تھی کہ ہمارے دوست جن کی دوستی کے امتحان کا انہیں کبھی موقع نہ ملا تھا۔ آکر چھڑا لیں گے۔ لیکن انہیں بہت جلد معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ وہ امید موہوم تھی۔ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ آہ سے

جو یہ دوست ہیں ایسے دشمن کہیں نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں
کیا امتحان ہم نے اکثر سرور بناوٹ کی تھی یہ دوستی اضطرار

بہت جلد ان مدیونوں کی قلب ماہیت ہو جاتی تھی۔ چہرے زرد

ہو جاتے تھے۔ بھوک سے جسمانی طاقت سلب ہو جاتی تھی۔ آنکھیں پتھرا جاتی تھیں۔ اور رنگ تازہ ہوا کے نہ ملنے سے سانولے ہو جاتے تھے۔ اندریں حالات یہ کہنا کہ قیدی جیل میں سڑنے اور گلنے کے لئے آتے تھے! اور رہائی اور آزادی کی امید کا چراغ ہمیشہ کے لئے گُل ہو جاتا تھا۔ ہرگز مبالغہ نہ تھا۔ گو اب وہ تشدد نہیں رہا۔ لیکن موجودہ حالت بھی کچھ ایسی ہے کہ انسان کا دل خون ہو جاتا ہے۔

بیس سال ہوئے کہ اِس جیل میں ایک مدیون قید تھا۔ اُس کی بیوی اور بچہ ہر روز اُسے اِس جیل میں ملنے آتے تھے۔ ماں اور بچہ کے لئے رات عجب مصیبت کی رات ہوا کرتی تھی۔ نہ سوتے کٹتی تھی نہ جاگتے کٹتی تھی۔ مُنہ اندھیرے ماں بچہ کو لے کر قید خانہ میں آتی تھی۔ قریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پھر اُسے شوہر کی ملاقات نصیب ہوتی۔ سُورج کے طلوع ہوتے ہی اُسے جیل سے رخصت کر دیا جاتا تھا۔ وہ بچہ کو گود میں اُٹھا کر پل پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اور اُسے زرپاش آفتاب شعاعیں دکھاتی تھی۔ کہ کسی طرح وہ بہل جائے۔ اور اُس کی بے چینی کسی طرح دُور ہو۔ لیکن زرد فام دُبلے پتلے۔ فاقہ کش بچے کو اس حال میں تُند خو آفتاب کیا خوش کر سکتا تھا۔ ناچار وہ اُسے گود سے اُتار کر میلی کچیلی شال میں لپیٹ لیتی۔ اور روتے روتے بے حال ہو جاتی تھی۔ مدیوں کے

خیالات بہت محدود تھے۔ لیکن جو بھی تھے اُن کا تعلّق باپ کی کج ادائی اور بے رحمی سے تھا۔ بچّہ گھنٹوں ماں کے گھٹنے پر بیٹھا ہُوا طفلانہ ہمدردی کے ساتھ اُس کے آنسوؤں کی جھڑی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ پھر آہستہ سے اُس کی گود سے نکل کر ایک کونے میں جا بیٹھتا اور روتے روتے سو جاتا تھا جب سے غریب بچّہ کو ہوش آیا تھا۔ بھوک۔ پیاس۔ جاڑا۔ اور محتاجی اُس کے گلے کا ہار تھے۔ بچّہ زندہ تھا لیکن شگفتگی۔ مسرت آمیز ہنسی۔ اور آنکھوں کی چمک نابود تھی ؛

مدیون باپ۔ اسیر زندان باپ اور مصیبت زدہ ماں بچّے کی قابل رحم حالت دیکھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ اور کچھ نہ کر سکتے تھے ؛

خوبصورت۔ تندرست اور رعنا جوان جو ہر قسم کی محنت اور مشقّت برداشت کر سکتا تھا اِس قید خانہ میں جو جائے تنگ و مردماں بسیار کا مصداق تھا۔ اور جہاں تازہ ہوا کا گزر نہ تھا فاقوں کی زحمت اُٹھا کر برف کی طرح پگھل رہا تھا۔ خوبصورت گُل اندام نازنین اُس کی بیوی تنگی۔ غم۔ جسمانی تکلیف۔ اور روحانی عذاب کے باعث نیم جاں تھی! اور بچّے کا معصوم دل ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا ؛

جاڑے کا موسم آ گیا۔ سردی ستم ڈھانے لگی۔ اور لگاتار بارش نے

اور بھی قیامت برپا کردی۔ مدیوں کی مہ لقا بیوی کی حالت چونکہ دن بدن بدتر ہو رہی تھی۔ اور ناداری حد سے زیادہ تھی۔ وہ پہلا مکان چھوڑ کر اس قید خانہ کے قریب ایک کوٹھڑی میں رہتی تھی۔ اور خوش تھی۔ کہ اور کچھ نہیں تو خاوند کے قریب تو ہے۔ دو ماہ برابر وہ اور اُس کا معصوم رفیق قید خانہ کے دروازہ پر آتے رہے۔ دو ماہ کے بعد ایک دن وہ نہ آئی۔ جب سے خاوند قید ہوا تھا۔ یہ پہلا ناغہ تھا۔ دوسرے دن وہ آئی تو معصوم بچہ اُس کے ساتھ نہ تھا۔ وہ تنہا آئی۔ کیونکہ بچہ جان دے کر عذاب زندگی سے آزاد ہو چکا تھا۔

جو لوگ اس درد سے ناآشنا ہیں۔ وہ فلاکت زدہ والدین کی مصیبت کا جن کا ایک ہی بچہ ہو اور مر جائے اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہاں میں کہتا ہوں۔ وہ ان کی جسمانی و روحانی تکلیف کا قیاس نہیں کر سکتے۔ جس وقت تمام دُنیا سرد مہر ہو کر بدل چکی تھی جب سب نے آنکھیں پھیر لی تھیں یہ بچہ ماں کے لئے آرام جان اور باپ کے لئے قرار دل تھا۔ جب ماں اُسے لے کر زنداں میں آتی تھی۔ تو وہ دونوں کے درمیان بیٹھ کر محبت سے اُن کے چہروں کی طرف تکتا تھا۔ اُن کا غم تھوڑی دیر کے لئے غلط ہو جاتا تھا۔ اور اُن کے کلیجوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی تھی۔ گو وہ دیکھ رہے تھے۔ کہ بچہ موم کی طرح پگھل رہا ہے۔

اور گو اس کی مختصر زندگی مسرت سے ناآشنا تھی۔ اور گو جان دے کر اُسے وہ آرام مل گیا۔ جس سے وہ زندگی میں بے بہرہ تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کی موت سے غمزدہ ماں کے سر پہ آسمان ٹوٹ پڑا۔ اور وہ زندہ درگور ہوگئی ؛

مصیبت زدہ بیوی کے چہرہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اب وہ صرف چند دن کی مہمان ہے۔ موت کے اطلاعنامہ کی تعمیل ہو چکی تھی۔ صرف تاریخ پیشی کا انتظار تھا۔ اِس لئے جب وہ آتی تھی تو دُوسرے قیدی دانستہ وہاں سے سرک جاتے تھے۔ اور میاں بیوی کو تنہا چھوڑ دیتے تھے۔ ایک دن وہ شام کو خلاف معمول آئی۔ مگر بڑی مشکل سے آئی۔ کمزوری سے قدم نہ اُٹھتا تھا کئی بار دم لے کر وہاں پہنچی جہاں اس کا خاوند پریشان بیٹھا تھا۔ اور اُس کے سینہ پر سر رکھ کر بیہوش ہوگئی۔ خاوند اُسے اُٹھا کر کھڑکی کے قریب لے گیا۔ اور چاند کی زرد روشنی میں دیکھا کہ اُس کے چہرے پر مردنی چھا رہی ہے ؛

بیوی۔ جارج مجھے زمین پر لٹا دے ؛

خاوند نے بیوی کو زمین پر لٹا دیا۔ اور اُس کا سر زانو پر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگا ؛

بیوی۔ پیارے جارج۔ دل نہیں چاہتا کہ میں تجھ سے جدا ہوں۔

تیری فرقت میں مجھے قبر میں بھی آرام نہیں مل سکتا۔ لیکن یہ خدا کی مرضی ہے اور ہماری مجال نہیں کہ کچھ کہہ سکیں۔ میری خاطر حوصلہ کر۔ خدا کا شکر ہے کہ ننھا اس عذاب سے چھوٹ گیا۔ اور آرام سے قبر میں سو رہا ہے۔ تم قید ہو۔ میرے مرنے کے بعد اگر وہ زندہ ہوتا تو خدا جانے اُس کا کیا حال ہوتا؟

خاوند۔ (رو کر) میری جان ایسی باتیں نہ کرو اور مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ خدا نے چاہا تو اچھّی ہو جاؤ گی۔ ذرا طبیعت کو سنبھالو ابھی یہ کمزوری دُور ہو جائے گی"

بیوی۔ نہیں پیارے جارج اب مَیں کوئی دم کی مہمان ہوں۔ ان لوگوں کو چاہیئے کہ مجھے میرے بچّے کے ساتھ دفن کریں۔ ہاں میری ایک درخواست ہے۔ وعدہ کرو اور قول دو کہ اگر تمہارے کبھی خدا نے دن پھیرے۔ اور اس جگہ سے رہائی ہوئی تو میری اور میرے بچّے کی لاش یہاں سے کہیں کسی گرجا کے خاموش قبرستان میں دفن کر دینا۔ کہو وعدہ کرتے ہو"

خاوند نے آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان کہا۔ کہ ہاں میری ممتاز مَیں سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن تم خاموش ہو گئیں۔ ایک دفعہ اور آنکھوں کو ملاؤ۔ ایک بار صرف ایک بار اور بات کر لو۔ لیکن میری

اُس کی زوجہ خاموش تھی۔ اگرچہ اُس کے زرد چہرے پر نُور برس رہا تھا۔ لیکن مُرغ رُوح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ اور جا آج اب دُنیا میں اکیلا تھا۔ تن تنہا ؛

غم جب حد سے بڑھ جائے تو انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اُس نے بیجان بیوی کا سر زمین پر رکھ دیا وہ دو زانو بیٹھ گیا۔ اور ہاتھ اُٹھا کر بولا "اے خدا۔ اے خدا۔ گواہ رہنا۔ مَیں حلفاً بیان کرتا ہوں اور اپنی بے جان بیوی کے پاس بیٹھ کر کہتا ہوں۔ کہ آج سے میری زندگی کا مقصد شہید ستم بیوی اور قتیل ظلم بچّے کی مَوت کا انتقام ہو گا۔ جب تک مَیں یہ مقصد پُورا نہ کر لوں آرام مجھ پر حرام ہو گا۔ میری نفرت اس سے جس نے ہمیں اس حال تک پہنچایا ہے۔ دوامی اور غیر فانی ہو گی میرا انتقام دیر پا اور مہیب ہو گا"؛

اس صدمہ سے اور آتش غضب سے اور جوش انتقام سے ایک ہی رات میں اُس کی کایہ پلٹ گئی۔ اُس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ اور اس کے ہمراہیوں کو اس سے دہشت آنے لگی۔ اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ اس کے قریب آتے ہوئے کنیاتے تھے ؛

مریم کا جنازہ ایک محتاج عورت کا جنازہ تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ بیکسوں کے جنازے کس شان سے قبرستان کو جاتے ہیں۔

بے کسی کھڑی رو رہی تھی۔ اور حسرتیں خاک اُڑا رہی تھیں۔ خاوند قید تھا۔ اور رشتہ دار غیر حاضر تھے۔ صرف چار اجنبی تابوت اُٹھانے کو کھڑے تھے۔ البتہ دو چار عورتیں قُرب و جوار سے جیسا کہ عورتوں کا دستور ہے بلالحاظ قرابت موجود تھیں۔ اور بین کر رہی تھیں جارج نے آخری مرتبہ بیوی کا مُنہ دیکھا مگر اب آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ سیلاب عظیم ختم ہو چکا تھا آنکھیں خشک تھیں۔ مگر دل خون رو رہا تھا۔ بیوی کا جنازہ زندان سے لے گئے۔ اور خاوند گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اب بخار سے اُس کا بدن تنور کی طرح گرم تھا۔ اور وہ کروٹیں بدل رہا اور ہذیان بک رہا تھا۔ لیکن بخار اور ہذیان میں انتقام کا خیال برابر موجود تھا۔ اب وہ یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ وہ ایک جہاز میں سوار ہے۔ موجیں اُٹھ رہی اور شور مچا رہی ہیں۔ بادل گرج رہا ہے۔ آندھی چل رہی ہے۔ یکایک ایک دُوسرا جہاز گرداب میں دکھائی دیتا ہے۔ جس کے بادبان پھٹے ہوئے اور مستول ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اور اہل جہاز واویلا کر رہے ہیں۔ کہرام مچا ہُوا ہے۔ قیامت برپا ہے۔ اس طوفان زدہ جہاز سے ایک انسان گر کر موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ اور جگر شگاف چیخیں مار کر مدد کے لئے بلا رہا ہے۔ پھر وہ دیکھتا ہے۔ کہ لہروں سے ایک پیر مرد نے سر اُٹھایا ہے اور دل گداز چیخیں مار کر

کہتا ہے کہ مجھے بچاؤ۔ وہ بُوڑھے کو دیکھتا اور سمندر میں کُود پڑتا ہے۔ وہ بُوڑھے کو شناخت کر کے اُس کی طرف لپکتا ہے۔ بُوڑھا بھی اُسے پہچان لیتا ہے۔ اور اُس کی گرفت سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر نہیں بچ سکتا۔ وہ بُوڑھے کو پکڑ کر کھینچتا ہُوا تختِ لشرے کو پہنچا ہے اور اُس وقت چھوڑتا ہے جب اُس کی جان نکل اور اس کی قسم پُوری ہو جاتی ہے۔

پھر اُسے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک لق و دق بیابان ور وحشت خیز ریگستان میں، گرم ریت پر برہنہ اور تنہا جا رہا ہے۔ ریت اُڑ کر اُس کی آنکھوں اور حلق میں داخل ہو رہی ہے۔ بادِ سموم کی تیزی سے اُس کا دم بند ہو رہا ہے۔ اور بصارت میں فرق آ رہا ہے۔ چاروں طرف انسانی اور حیوانی ہڈیوں کے ڈھیر ہیں۔ یہ ہڈیاں اُن قافلوں کی ہیں۔ جنہیں بادِ سموم نے اِس صحرا میں تباہ کیا تھا ہرچند کہ ریت قیامت برپا کر رہی ہے۔ لیکن وہ کسی آسمانی طاقت کے زور سے ریت کے ٹیلوں اور ستونوں کو چیرتا ہُوا۔ بادِ سموم کے بگولوں کے باہر نکلتا ہے۔ اور زمین پر گر کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ پھر نسیم خوشگوار کے جھونکے پنکھا جھل کر اور بہتے پانی کے چشمہ کی روانی کا نغمہ اُسے ہوش میں لاتے ہیں۔ چونکہ صحرا کی ریت اور تمازتِ آفتاب کی وجہ سے اُس کا حلق خشک اور زبان لکڑی ہو رہی ہے۔ وہ پیٹ بھر کر آبِ سرد خوشگوار پیتا اور

پیاس بجھاتا ہے۔ اور پھر چشمہ میں غسل کر کے آرام سے لیٹ اور سو جاتا ہے۔ پھر اُسے قدموں کی آہٹ سُنائی دیتی ہے۔ اور اُس کی آنکھ کُھلتی ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھا انسان جس کے سر کے بال برف کی طرح ہیں۔ اور جو پیاس سے مثل ماہی بے آب بیقرار ہے۔ اُس کی طرف گرتا پڑتا آرہا ہے۔ وہ پہچان لیتا ہے۔ کہ بوڑھا وہی ہے۔ وہ دوڑ کر اُسے روک لیتا ہے۔ اور قدم آگے بڑھانے نہیں دیتا۔ بوڑھا دوہائی دیتا ہے۔ منت کرتا ہے۔ خدا کا واسطہ ڈالتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ مَیں مر رہا ہوں صرف ایک گھونٹ پانی پی لینے دو۔ مگر وہ نہیں مانتا۔ پیر مرد ہر چند جدو جہد کرتا ہے۔ مگر اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔ آخر پیاس کی شدّت سے دم توڑ کر رہ جاتا ہے۔ اور بیجان ہو کر اُس کے پیروں میں گر پڑتا ہے۔

جب مدیون کا بخار اُترا اور اُسے ہوش آیا۔ تو وہ قیدی زندان نہ تھا۔ وہ امیر کبیر تھا۔ سنگ دل باپ جس نے اُسے گھر سے نکال دیا تھا اُس کی بیماری کے ایام میں چل بسا۔ اور بروئے وصیّت اُسے محروم الارث نہ کر سکا۔ وہ تندرست اور طاقتور تھا۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ انسان پانی کا بُلبلا ہے۔ وہ بیٹے کو عاق کر کے محروم کرنا چاہتا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کسی دن نئی وصیّت سہولیّت کے ساتھ لکھے۔ کہ

پیغام اجل آگیا۔ اپنے نرم مخملی بستر پر رات آرام سے سویا اور پھر نہ جاگا۔ خدا کی شان وہی بیٹا جسے وہ دشمن سمجھتا تھا۔ جس کی صورت سے وہ بیزار تھا۔ اُس کا وارث ہُوا +

ابھی تک ہم نے یہ نہیں بتایا کہ جارج ہیلنگ کس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اُس کا دُشمن کون تھا۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ جس شخص نے اُسے قید خانہ کا مُنہ دکھایا وہ اس کا خُسر تھا۔ وہ مریم کا باپ تھا۔ مریم نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف جارج ہیلنگ سے شادی کرلی۔ باپ خفا ہوگیا۔ اور اس قدر بگڑا کہ نہ صرف اُس سے قطع تعلّق کرلیا۔ بلکہ اُس کے خاوند کو تباہ اور برباد کرکے چھوڑا۔ اُس کے ایما سے وہ قید ہُوا۔ پھر جب بیٹی محتاج ہو کر مدد کے لئے اُس کے ہاں گئی۔ تو اُسے دھکّے دے کر نکلوا دیا۔ زمانہ کا حال دیکھئے۔ باپ بیٹی اور نواسہ کی مَوت کا باعث اور داماد کی تباہی کا موجب ہوا +

اگرچہ جارج اب امیر تھا۔ لیکن بیوی اور بیٹے کی عدم موجودگی میں یہ دولت اُس کے لئے کانٹوں کا بستر تھی۔ اور اُس کے خانۂ دل میں چراغ مسرت ہمیشہ کے لئے گُل ہو چکا تھا زندگی اُس کے لئے وادی وشت پُر خطر تھا۔ کہ جو اُس نے بیماری کے ایام میں تصوّر سے دیکھا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ مگر صرف انتقام کے لئے۔ اور تاخیر سے جو واقع

ہو رہی تھی۔ وہ سخت ناراض تھا اب وہ بستی سے بیزار تھا۔ اِس لئے ساحل سمندر کے قریب ایک مکان میں رہتا تھا۔ اور وہاں شب و روز مقام کے منصوبے سوچا کرتا تھا۔

ایک دن وہ حسب معمول شام کے قریب گھر سے نکلا۔ وہ اگرچہ خانہ نشین تھا۔ لیکن شام کے وقت ہوا خوری کے لئے ضرور نکلتا تھا۔ اور کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہل کر ایک چٹانی پتھّر پر جو ساحل کے قریب پڑا تھا بیٹھ کر سمندر کی لہروں اور شفق کے بھیریوں کا تماشا دیکھا کرتا۔

جارج پتھّر پر بیٹھا ہُوا تھا کہ اُس نے ایک چیخ سُنی۔ وہ اس طرف دوڑا اور دیکھا کہ ساحل پر لباس پڑا ہے اور لہروں میں ایک انسان غوطے کھا رہا ہے۔ اور کنارے پر ایک پیر مرد ہاتھ مل رہا اور امداد کے لئے چلّا رہا ہے۔ جارج نے اپنا کوٹ اُتار دیا۔ اور سمندر کی طرف اِس نیّت سے دوڑا کہ اس میں کُود کر ڈوبتے ہوئے کو بچائے۔

پیر مرد۔ اے جوان خدا کے لئے جلدی کر۔ یہ جو ڈوب رہا ہے میرا بیٹا ہے۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اسے بچا۔ ہائے مَیں کیا کروں۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے ڈوب رہا ہے۔ پیر مرد کی آواز سُن کر جارج جو سمندر کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یک لخت ٹھہر گیا۔ اور طاقت حس و حرکت زائل ہو گئی۔ اور پیر مرد کا رنگ رُخ متغیّر

ہو گیا۔

پیر مرد۔ کیوں۔ کیا ہے لنگ ؟

جارج نے کچھ جواب نہ دیا صرف مسکرانے لگا۔

پیر مرد۔ (دیوانہ کی طرح) میرے بچے۔ میرے آنکھوں کے نُور۔ ہے لنگ۔ ادھر دیکھ۔ ابھی میرا بیٹا زندہ ہے۔ ابھی وقت ہے۔ اسے بچاؤ۔

جارج پھر مسکرایا۔ مگر پہلے کی طرح بُت بنا رہا۔

پیر مرد نے جارج کے قدم چُوم لئے۔ اور کہا کہ بے شک میں نے تجھ پر ظلم کیا ہے۔ لیکن مجھے معاف کر بیشک مجھے اِس سمندر میں غرق کر دے۔ بیشک مجھ سے انتقام لے لیکن میرے فرزند کو جو ڈوب رہا ہے خدا کے لئے بچا۔ وہ ابھی نوجوان ہے۔ ابھی اُسے مرنا نہیں چاہیئے۔

جارج نے پیر مرد کی کلائی زور سے پکڑ لی اور کہا۔

جارج۔ جان کا عوض جان ہے۔ میں جان کے عوض جان لونگا۔ دو جانیں تم نے مجھ سے چھینی ہیں۔ آج ایک کا بدلہ مجھے مل رہا ہے۔ میرا بیٹا بھی اپنے باپ کی آنکھوں کے سامنے مرا تھا۔ یہ پاجی جو ڈوب رہا ہے۔ اور جس نے اپنی بہن کو بدنام کیا۔ اور تمہارے کان بھرے اِس عذاب سے جو اُسے مل رہا ہے۔ بہت زیادہ

تکلیف کا مستحق ہے۔ اور یہ تکلیف جو اُسے ہو رہی ہے اُس تکلیف کے مقابلہ میں جو میرے معصوم بچّے کو دی گئی ہیچ ہے۔ میری بیوی نزع کی حالت میں تھی اور تم ان آنکھوں سے دیکھ رہے اور ہنس رہے تھے۔ آنکھیں وہی ہیں ان سے سمندر کی طرف دیکھو"

جارج نے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔ پیر مرد نے جبراً و قہراً ادھر دیکھا۔ ڈوبنے والے کی آخری کوشش ختم ہو چکی تھی۔ لہروں میں چند لمحوں کے لئے بُلبلے اُٹھے اور غائب ہو گئے اور لہریں اصلی حالت پر آ گئیں۔

(۲)

تین سال گزر گئے۔

ایک شریف انسان اپنے گھر کی بیش قیمت گاڑی سے لنڈن کے ایک مشہور و معروف وکیل کے دفتر کے روبرو ٹھیرا۔ اور اندر گیا۔ اگرچہ اس شریف جوان کا عالم شباب تھا۔ لیکن اُس کا چہرہ زرد اور پژمردہ تھا۔ اور وہ افسردہ خاطر اور اُداس معلوم ہوتا تھا۔ وکیل کی تجربہ کار آنکھوں نے فوراً بھانپ لیا۔ کہ غم اور الم یاس اور حرمان نے اُسے قبل از وقت ضعیف کر دیا ہے۔ اجنبی کے ہاتھ میں ایک بھاری لفافہ تھا۔

اجنبی - میں قانونی کاروبار آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں ۔

وکیل - (بھاری لفافہ کی طرف دیکھ کر) بہت اچھا فرمائیے ۔

اجنبی - یہ معمولی کام نہیں - بہت سا وقت اور بے شمار روپیہ صرف کرکے بڑی محنت کے بعد میں نے یہ کاغذات جمع کئے ہیں ۔

اجنبی نے لفافہ کھولا تو اُس میں کئی تمسکات - ہنڈیاں - پرامیسری نوٹ اور رہن نامے اور وثیقے تھے ۔

مقروض کے ذمہ ان کاغذات کی رو سے بہت سا قرضہ ہے - گذشتہ چند سال سے اُس کا کاروبار بند ہے اور مالی مشکلات میں گرفتار - یہ کاغذات میں نے اُس کے قرضخواہوں سے ان کی اصلی مالیت سے سہ چند اور چہار چند بدل دے کر خریدے ہیں - اگر ان کی رو سے دعاوے کئے جائیں - اور جو ڈگریاں ہو چکی ہیں اُن کا اجرا کرایا جائے تو وہ خاک میں مل جائے گا ۔

وکیل - (کاغذات دیکھ کر) بروئے کاغذات اُس کے ذمہ کئی لاکھ روپیہ ہے ۔

اجنبی - بے شک ہے ۔

وکیل - پھر کیا کرنا ہے ؟

اجنبی - کیا کرنا ہے ؟ ہر قسم کی حکمت عملی اور چالاکی - جو وکیلوں کا خاصہ

ہے۔ کام میں لاؤ۔ رائی کا پہاڑ بناؤ۔ بال کی کھال کھینچو۔ دفعات ضابطہ
کی تعبیر اپنے مطلب کے موافق کرو۔ میری خواہش ہے کہ اُس کی جان
عذاب میں آ جائے۔ وہ تباہ اور برباد ہو کر محتاج ہو جائے۔ آخرکار
مدیونوں کے قید خانہ میں کتّے کی موت مرے +

وکیل۔ بہت اچھا۔ لیکن اس تمام کارروائی کا خرچ کون دے گا اِس کام
کے لئے بہت سا روپیہ درکار ہوگا +

اجنبی۔ جو مانگو گے دونگا۔ رقم تعیّن کرو اور ابھی لو +

جس وقت اجنبی باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے جوش کا یہ حال تھا۔ کہ
اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور قلم پکڑا نہ جاتا تھا +

وکیل نے اپنے جائز حق سے بہت زیادہ رقم کا نام لیا۔ اور اجنبی نے
بلا تامل چک لکھ کر اُس کے حوالہ کیا۔ دوسری بات نہ کی اور رخصت ہُوا +
وکیل کو چک کا روپیہ بنک سے فوراً وصول ہو گیا۔ اور اُس نے
نہایت سرگرمی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ نقب تیار کرکے اُس میں بارود
بچھا دی۔ دو سال تک مقدمات ہوتے رہے۔ اور آخرکار ڈگریاں ہو گئیں۔
پھر مدیوں کے مکانات اور سامان قرق کیا گیا مدیون نے ہر چند کہا کہ
مجھے مہلت دو۔ مَیں آہستہ آہستہ قرضہ ادا کر دوں گا۔ یا خود جائداد
کو اچھی قیمت پر فروخت کرکے مطالبہ بیباق کر دونگا۔ مگر مُہلت نہ ملی۔ اور

تمام جائداد کوڑیوں کے مول نیلام ہوگئی۔ اِس صورت میں نصف قرضہ بھی صاف نہ ہُوا۔ اور مدیون محتاج ہوگیا۔ اس کے بعد وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ اور بوڑھے مدیون کے قید ہونے میں شک نہ تھا مگر وہ روپوش ہوگیا۔ اور قید نہ ہوسکا ؂

جارج ہے لنگ اپنے دشمن کی بربادی پر خوش ہو رہا تھا۔ جب اُس نے سُنا کہ مفرور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں گیا۔ تو اُس کی آتش خشم دوزخ کی آگ کی طرح بھڑک اُٹھی۔ اِس وقت اُس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ دانت پیس رہا تھا۔ اور پیادوں کو جن کے پاس وارنٹ تھا۔ اُن کی غفلت پر بے نقط گالیاں دے رہا تھا۔ قریب تھا۔ کہ وہ دیوانہ ہوجائے کہ وکیل آگیا۔ اور اُسے تسلّی دے کر کہنے لگا۔ کہ آپ خاطر جمع رکھیں۔ کب تک روپوش رہے گا۔ آخر پکڑا جائیگا۔ یہ سُن کر جارج کو یک گونہ اطمینان ہُوا ؂

اس کے بعد کئی ہفتے جارج ہے لنگ وکیل کے دفتر میں نہ آیا۔ اور نہ کسی نے اس کی شکل ہی دیکھی۔ مگر ایک دن جبکہ وکیل اپنے رہائشی مکان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا کہ وہ وہاں آیا۔ اور اطلاع کرائی۔ وکیل نے اُس کی آواز پہچان لی۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ کہتا کہ انہیں کہو تشریف لے آئیں۔ ہے لنگ بلا اجازت وکیل کے گول کمرے میں

گھس آیا۔ اور ایک چوکی پر گر پڑا۔ اُس وقت اُس کا سانس پھُولا ہُوا تھا۔ اور رنگ زرد تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ کمرے کے سب دروازے بند کر دئیے۔ اور آہستہ سے کہا۔ میں نے اُس کا پتہ لگا لیا ہے ٭

وکیل۔ سچ کہو۔ خوب کیا۔ کیا کہنا ٭

جارج۔ وہ قصبہ کیمبڈن میں رہتا ہے۔ اس عالیشان محل کے رہنے والے نے اب ایک ذلیل کوٹھری لے رکھی ہے۔ اچھا ہُوا کہ وہ فوراً گرفتار نہ ہُوا۔ اب وہ نان شبینہ کو محتاج ہے۔ اور اُس کے پاس ایک کوڑی نہیں ٭

وکیل۔ بہت اچھا۔ کل صبح چل کر اُسے گرفتار کریں گے ٭

جارج۔ بہت اچھا۔ لیکن نہیں کل گرفتار نہ کرو۔ بجائے کل کے پرسوں اُسے پکڑیں کیونکہ پرسوں سالگرہ ہے۔ آپ بیلف اور پیادوں کو اطلاع دیدیں۔ تاکہ وہ آٹھ بجے پرسوں آپ کے مکان پر موجود رہیں۔ میں خود اُن کے ہمراہ جاؤں گا ٭

مقررہ وقت پر جب ہے لنگ وکیل کے مکان پر آیا تو آگے فارق اور پیادے وہاں موجود تھے۔ اور اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ ہے لنگ نے ایک کرایہ کی گاڑی منگائی۔ اور اُن کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا۔ جہاں بُوڑھا مدیون روپوش تھا یہ اِس کُوچہ کا بدترین مکان تھا ہے لنگ نے پیادوں سے کہا کہ تم کُوچہ میں ٹھہرو۔ میں تنہا اندر جاؤں گا۔ پھر اُس نے زنجیر در کھڑکائی

اور ایک عورت نے جو ہے لنگ کو جانتی تھی۔ اور اُس کی اِس معاملہ میں راز دار تھی دروازہ کھولا۔ ہے لنگ اندر داخل ہُوا۔ اِس وقت اُس نے ایک لمبا چوغہ پہنا ہُوا تھا۔ اور سر کی ٹوپی اِس قسم کی تھی۔ کہ چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بُوڑھا مدیون ایک تخت پوش پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ اور اُس کے قریب ایک بدنما چراغ دھرا تھا۔ بار مصیبت سے اِس وقت اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ اور ضعف و نقاہت گریبان گیر تھے۔ ایک اجنبی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ چونکا۔ اور بمشکل تمام اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں گویا ہُوا:

"یہ کیا۔ یہ کیا۔ یہ کونسی تازہ مصیبت ہے۔ تم کون ہو۔ اور کیا چاہتے ہو؟"

ہے لنگ۔ صرف دو باتیں کرنی ہیں:

یہ کہا اور اُس نے سر سے ٹوپی اُتار دی۔ اور تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ پیر مرد کی طاقت گویائی ہے لنگ کو دیکھتے ہی سلب ہو گئی۔ وہ تخت پوش پر گر کر ہاتھ ملنے لگا۔ اور ایسی نگاہ سے جس میں خوف اور نفرت بھری تھی۔ اُس کی طرف دیکھنے لگا:

جارج۔ آج چھ سال ہو گئے کہ جب میں نے ساحل پر اپنے دو جانوں کے مطالبہ میں ایک جان وصول کی تھی۔ وہ جان میرے معصوم بچّہ کی جان کا معاوضہ تھا۔ اور بُوڑھے تیری بیٹی کی بے جان لاش کے پاس بیٹھ کر میں نے

عہد کیا تھا۔ اور قسم کھائی تھی کہ انتقام لونگا۔ اُس وقت سے میں نے ایک منٹ آرام نہیں کیا۔ اور لگاتار کوشش جاری رکھی۔ جب کبھی میں کاہل ہوتا تھا۔ تو میرے معصوم بچے کا چہرہ اور میری مظلوم بیوی کی حالت نزع میری آنکھوں کے سامنے آکر آگ پر تیل کا کام کر دیتے تھے۔ میرا پہلا فعل تلافی اے بُوڑھے تجھے یاد ہو گا۔ وہ پہلا تھا۔ اور یہ آخری اور دُوسرا +

پیر مرد کانپنے لگا اور اُس کے ہاتھ ڈھیلے ہو گئے +

کل میں انگلستان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا۔ اور آج تجھے زندہ مَوت کے حوالہ کر دوں گا۔ وہی زندہ مَوت جس کو تُو جانتا ہے۔ اور وہ زندان مدیون ہے +

جارج نے یہ کہا اور بُوڑھے کے چہرہ کی طرف نگاہ کی۔ پھر چراغ اُٹھا کر بغور دیکھا۔ چراغ رکھ دیا۔ اور اس کوٹھڑی سے نکل کر نیچے اُتر آیا +

باہر وہی عورت جس نے دروازہ کھولا تھا۔ کھڑی تھی۔ جارج نے اُسے مخاطب کر کے کہا کہ بُوڑھے کی خبر لو وہ بیمار معلوم ہوتا ہے۔ اور پیادوں کو ہمراہ لے کر بلا تعمیل وارنٹ گاڑی میں سوار ہو گیا +

اُن کے جانے کے بعد عورت نے دروازہ بند کر لیا۔ اور اُوپر جا کر دیکھا تو بُوڑھا مدیون بیجان پڑا تھا +

کنٹ کے ایک پُر امن اور شور و غل سے دُور گورستان میں جو ایک گرجا سے ملحق ہے دلکشا درختوں کے سایہ میں ایک سادہ قبر بنی ہوئی ہے۔ یہ جارج ہیٹےٹنگ کی بیوی اور معصوم بچے کی جائے آرام ہے۔ جہاں وہ دونوں سوتے ہیں۔ اور حشر تک سوتے رہیں گے لیکن قسمت میں یہ نہ تھا۔ کہ بیوی کا شوہر اور بچے کا باپ اُن کے پہلو میں آرام گزیں ہو*

اُس دن کے بعد وکیل نے اپنے عجیب موکل کی پھر صُورت نہ دیکھی۔ نہ اُسے یہ معلوم ہُوا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا*

معافی

(۱)

یاسمین ہوبہو یاسمین تھی۔ وہی رنگ وہی خوشبو۔ بوٹا سا قد گُل اندام۔ خوش خرام۔ وہ ایک امیر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں باپ عیسائی تھے۔ انہوں نے بیٹی کی شادی اٹھارہ سال کی عُمر میں ایک نوجوان ڈیوڈ چند والال سے کردی۔ مسٹر چند والال خوبصورت تھا۔ سرو قد تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ بظاہر اس میں تمام خوبیاں تھیں جو ایک مرد میں ہونی چاہئیں لیکن وہ اپنے پُرانے فیشن کے خُسر اور خوشدامن کو جنہیں موجودہ زمانہ کی ہوا نہ لگی تھی پسند نہ کرتا تھا! ور اپنے دوستوں سے ازراہ مذاق کہا کرتا تھا۔

"ان کی کیا پُوچھتے ہو دونوں پُرانے معدنی پتھر ہیں"

(۲)

جب یاسمین کے ماں باپ قُدرت کا قرضہ ادا کرکے آخر مُلک عدم کو

روانہ ہوئے تو ان کی تمام جائداد ان کی اکلوتی بیٹی کو ملی اور ملنی چاہیئے تھی کیونکہ بیٹی کے سوا اس کا کوئی وارث نہ تھا۔

یاسمین کو اپنے خاوند سے بڑی محبّت تھی۔ لیکن وہ اپنی ماں کی تربیت کی وجہ سے تنہائی پسند تھی۔ خاوند کا اور صرف خاوند کا چہرہ اس کے لئے جنّت نگاہ اور شوہر کی صرف شوہر کی آواز اس کے لئے فردوس گوش تھی۔ اگر سیر کے لئے نکلتی تھی تو خاوند کے ساتھ۔ اگر کبھی تھیئٹر یا سینما دیکھنے جاتی تو اس کے ہمراہ۔ عیسائی رسم کے بموجب وہ مردوں سے نہ ملتی تھی۔ کرسچن طرز معاشرت کی رو سے مرد اور عورتیں بلا تکلّف مل سکتی ہیں عورتوں کے دوست مرد اور مردوں کی دوست عورتیں ہو سکتی ہیں۔ مگر یاسمین اس قاعدہ سے مستثنےٰ تھی۔ نہ تو کوئی مرد اس کا دوست اور نہ کوئی عورت اس کی سہیلی تھی۔ وہ اپنے سرتاج کو دیکھ کر جیتی اور اس کی محبّت میں خوش تھی۔ یہ دُنیا اس کے لئے فردوس تھی۔

(۳)

یاسمین کو اپنے خاوند پر پُورا اعتبار تھا۔ اس کے خیال میں وہ فرشتہ تھا جس کے قریب گناہ نہیں آسکتا۔ چندولال جو چاہے کرتا تھا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ جب چاہے گھر آتا اور جب چاہے جاتا تھا۔ کئی بار ایسا اتّفاق ہوتا تھا کہ وہ تمام رات گھر سے غائب رہتا۔ اور یہ کہدیا کرتا کہ ضروری کام تھا جس کی وجہ سے نہ آسکا۔ نیک نیت بیوی فوراً یقین کر لیتی تھی اور بیوی کے

یقین کی وجہ سے وہ اِس قدر دلیر ہو گیا تھا کہ مہینے میں دس دس دن گھر میں تو بیس دن باہر گزارتا تھا۔ بھولی بھالی یاسمین کو اس دُنیا کا حال معلوم نہ تھا جس میں لوگوں کا خیال ان کی گفتگو سے مختلف ہوتا ہے۔ جہاں لوگ کہتے ہیں کچھ اور کرتے ہیں کچھ۔ جہاں نیک نیت انسانوں سے ہمیشہ دھوکا ہوتا ہے۔ جہاں ان کا جو صادق اور باوفا ہیں مذاق اُڑاتے ہیں اور ان سے جو نیک ہیں بدسلوکی کی جاتی ہے۔ اِس دُنیا میں بعض نیک مرد اور بعض نیک عورتیں اِس قسم کی ہیں کہ وہ اندھا دُھند۔ صداقت۔ وفا اور اعتبار کی پرستش کرتی ہیں اور مرتے دم تک اصلیت کو دیکھنا ان کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ اِس دنیا میں بعض عورتیں اور بعض مرد ایسے ہیں کہ گو وہ دھوکا تو نہیں کھاتے لیکن اصلیت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے وہ غلطیاں کرتے ہیں ان پر وحشت غالب آجاتی ہے اور اپنے آپ کو بےرحم قسمت کا کھلونا یا برگشتگئی بخت کا شہید سمجھ کر مایوس مطلق ہو جاتے ہیں۔ یاسمین ان عورتوں میں سے تھی جن میں حد سے زیادہ یقین کی وجہ سے سوا وفا کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اِس لئے اسے کبھی بھُول کر بھی شک نہ ہُوا کہ اس کا خاوند بدنیتی سے کئی کئی دن گھر نہیں آتا ہے +

(۴)

لیکن ایک دن اسے گمنام خط ملا۔ خط پڑھ کر اس پر بجلی گر گئی۔ وہ بہت

سادہ مزاج تھی اِس لئے نہ سمجھی کہ گمنام نوٹس سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی ذلیل اور قابلِ نفرت نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے گمنام ہونا جو بُزدل کا ہتھیار ہے حقارت کا مستحق ہے۔

مضمون خط یہ تھا۔ کہ مجھے تیری بہتری مطلوب ہے۔ مجھے تجھ پر رحم آتا ہے۔ مَیں بدوں کو سزاوار عذاب سمجھتا ہوں۔ اِس لئے تجھے اطلاع دیتا ہوں کہ تیرا خاوند بے وفا ہے وہ گھر سے غائب اِس لئے رہتا ہے کہ اس کی مسودین سے گزشتہ دو سال سے آشنائی ہے اور یہ عورت بیوہ ہے۔ بھولی بھالی یاسمین میں یہ طاقت نہ تھی کہ اِس صدمہ کو چھپائے یا خُفیہ طور پر خاوند کے حالات معلوم کرے اِس لئے جب وہ ناشتہ کے لئے دوپہر کے بعد گھر آیا تو خط اس کے روبرو ڈال دیا اور رونے لگی پھر روتے روتے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

(۵)

مسٹر چندولال پانچ منٹ تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے پانچ منٹ کے بعد وہ اُٹھا۔ اسی اثنا میں اس نے اپنا جواب دعوے تیار کر لیا اور یاسمین کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ لیکن آنکھیں چار نہ کر سکی۔ وہ بیٹھ گیا۔ بیوی کو اپنے زانو پر بٹھا لیا اور بہ لب تبسم رینہ بولا۔

پیاری یاسمین کیا تم خفا ہوگئیں۔ واہ تم بھی حد ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسز ڈین میری ایک رشتہ کی خالہ کی بیٹی ہے۔ اور گزشتہ دس سال سے میرا اس کے ہاں آنا جانا ہے۔ اور مسز ڈین نہایت ہی شریف لیڈی ہے۔ بیچاری بیوہ ہے۔ مذہب کی پابند ہے۔ ہر اتوار کو گرجا جاتی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میری کئی لیڈیوں سے ملاقات ہے۔ لیکن میں نے کبھی تم سے ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ تم تنہائی پسند ہو۔ اور سوسائٹی سے ہمیشہ دُور رہتی ہو۔ خدا جانے کس کمینہ نے تمہارا دل بُرا کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا شک دُور ہو جائے۔ اس لئے لباس تبدیل کر کے میرے ساتھ چلو اور اپنی آنکھوں سے میری خالہ زاد بہن مسز ڈین کو دیکھ لو۔ مجھے کامل یقین ہے کہ تم اسے دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو جاؤ گی۔ اور اسے سہیلی بنا لو گی۔

(۶)

یاسمین کا شک جاتا رہا وہ نہایت گرمجوشی سے خاوند سے بغلگیر ہوئی اور بوجہ اس اشتیاق کے جو عورتوں میں فوراً اس وقت پیدا ہو جاتا ہے جب کسی عورت کا نام ان کے شوہر کے سلسلہ میں آ جائے وہ خاوند کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ خاوند اسے وارث روڈ پر ایک مختصر مگر دلکشا کوٹھی میں لے گیا۔ پانچ منٹ تک دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے۔ پھر دروازہ کھُلا۔ اور ایک سانولی پستہ قد دہرے بدن کی عورت نمودار ہوئی۔

یاسمین کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی اور پھر مُسکرانے لگی۔ مسٹر چندولال نے ان کا تعارف کرایا۔ مسز دین کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ جس میں حیرت اور مسرّت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی نکلی اور وہ بازو پھیلا کر بڑی تیزی سے یاسمین کی طرف بڑھی۔ اور بولی "راس خوش قسمتی پر قُربان جاؤں۔ مجھے یہ امید نہ تھی کہ تم میرے ہاں آؤ گی۔ مشہور ہے کہ تم نہ تو کسی کے ہاں جاتی ہو نہ کسی سے ملتی ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے بڑی مسرّت ہوئی ہے۔ تمہارے خاوند سے میری محبّت ہے۔ یہ ایک بے نظیر انسان ہے" یہ کہا اور مسز دین نے بہنوں کی طرح یاسمین کے خاوند کو دیکھا۔ یاسمین کا شک اور شُبہ کافور بن کر اُڑ گیا +

(۷)

ایک ماہ کے عرصہ میں دونوں عورتیں پکّی سہیلیاں بن گئیں۔ جب تک مسز دین کو یاسمین ہر روز نہ دیکھ لے اسے چین نہ آتا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ دن میں دو بار ملتی تھیں شام کا کھانا تینوں بلا ناغہ اکٹھے کھاتے تھے۔ اب مسٹر چندولال گھر سے غیر حاضر نہ ہوتا تھا۔ اور ہنس کر کہا کرتا تھا۔ سچ ہے۔

"جیسا سُکھ چوبارے۔ نہ بلخ نہ بخارے"

یعنی جیسا آرام گھر میں ملتا ہے کہیں اور میسّر نہیں ہو سکتا۔ دو ماہ نہ گزرے

تھے کہ مسز دین کی کوٹھی کے ساتھ والی عالیشان کوٹھی خالی ہوگئی اور یاسمین جو دولتمند باپ کی دولتمند بیٹی تھی مسز دین کے ساتھ ہردم رہنے کی خوشی میں اِس کوٹھی میں اُٹھ گئی۔ دو سال گزر گئے اب یہ دونوں عورتیں یک جان اور دو قالب تھیں۔ ان کی محبت محبت رُوح اور دل تھی۔ دو سال میں آسمان مسرت پر ایک دن بھی کدورت کا بادل دکھائی نہ دیا۔ یاسمین کی آنکھوں میں اس کی سہیلی مروّت اور محبت کا اوتار تھی +

(۸)

یکایک مسز دین بیمار ہوگئی۔ اور یاسمین کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ مسٹر چند ولال بھی زرد ہوگیا۔ اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں مریضہ کے کمرے میں گئے۔ جو اب صاحب فراش تھی۔ بیوی مریضہ کے سرہانے کھڑی ہوئی اس کے رخساروں کے بوسے لے رہی تھی۔ اور خاوند پائنتی پکڑے اس کی طرف نگاہ غم وحسرت سے تک رہا تھا۔ مریضہ کے گال پچکے ہوئے تھے۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ ناگاہ مریضہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ میاں بیوی نے سمجھا کہ وہ سو گئی ہے۔ وہ شب بیداری کی وجہ سے تھک کر چور ہورہے تھے۔ وہاں سے سرک کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے بنگلہ پر چلے گئے۔ جو مریضہ کی کوٹھی کے بالکل ملحق تھا +

(۹)

وہ دونوں ملول اور مغموم کھانا کھانے کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ مریضہ کی خادمہ ایک کاغذ کا پُرزہ جس پر چند سطریں پنسل سے گھسیٹی ہوئی تھیں لائی اور مسٹر چندولال کو دیا۔ کاغذ پڑھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا اور حواس باختہ بولا۔ تم یہیں ٹھہرو۔ یہاں سے کہیں نہ جانا۔ میں دس منٹ میں آیا"۔

خاوند کی فرمانبردار بیوی یاسمین کی سرشت میں تھی۔ اگرچہ اسے حیرت ہوئی مگر وہ ازراہ امتثال امر وہیں بیٹھی رہی۔ جب بہت دیر ہو گئی اور وہ نہ آیا تو وہ اُٹھ کر خاوند کے کمرے میں گئی اور میز پر وہی کاغذ کا پُرزہ مسلا دسلا پڑا تھا۔ وہ باز نہ رہ سکی۔ وہ خاوند کی اچانک وجہ دریافت کرنے کو بیتاب تھی۔ اس نے پُرزہ اُٹھایا۔ اس کے شکن دُور کئے اور پڑھا۔

اس میں لکھا تھا "مجھے اِس وقت ہوش ہے۔ مگر یہ آخری سنبھالا ہے۔ میرے دِل کے مالک۔ ایک بار آ کر مجھے سینے سے لگا لو۔ مگر تنہا آنا۔ یاسمین کو ساتھ نہ لانا۔ میں مر رہی ہوں"۔

پہلے تو وہ اس کا مطلب نہ سمجھی۔ مگر پھر فوراً ہی بجلی کی چمک کی طرح اصلیت اِس پر آشکارا ہو گئی۔ اب وہ سمجھ گئی کہ بات کیا ہے۔ اور اسے

بے ایمانی۔ دغابازی۔ اور بدنام بیوفائی کا شکار کیا گیا ہے۔ اب وہ سمجھی کہ کیوں اس کا خاوند مریضہ کے سامنے بیٹھ کر اسے فسانے سُناتا اور کتاب کا ایک صفحہ ختم کر کے عجیب نگاہ سے اس کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ اس وقت اس جاں نثار عورت پر جو خاوند کی پرستار تھی جو صدمہ ہُوا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کے دل میں درد اُٹھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور مایُوسی نے آندھی بن کر قصر تحمّل برباد کر دیا۔

(۱۰)

دفعتاً اس کے خاوند کے قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور کواڑ اندر سے بند کر لئے۔ اسی اثنا میں خاوند نے آکر اسے پکارا۔

"بہت جلد آؤ مسز ڈین پر اس وقت سکرات کی حالت طاری ہے"۔

"یاسمین نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھولا اور کہا:۔

"وہ چاہتی ہے کہ تم اسے اکیلے ملو۔ تم ہی جاؤ مَیں نہیں آسکتی"۔

خاوند کی حالت اس وقت غم اور صدمہ سے پریشان تھی۔ اس نے تلخ ہو کر کہا۔

"مَیں کہتا ہوں وہ مر رہی ہے جلدی چلو"۔

یاسمین نے کہا۔ تمہاری آرزو تو یہ تھی۔ کہ اس کی جگہ مَیں مر رہی ہوتی۔

بس بس میں نہیں آتی"۔

اب گنہگار شوہر سمجھ گیا کہ راز طشت از بام ہو گیا۔ اس لئے وہ اکیلا مرنے والی کے کمرے میں گیا۔ اور اب چونکہ پردہ فاش ہو چکا تھا۔ اس نے شرم اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر دیوانوں کی طرح کھلم کھلا مرنے والی کا ماتم کیا اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کی کہ اس کی حور شمائل بیوی کا دل خون ہو کر بہ رہا ہے۔

(۱۱)

چند دن تو مسٹر چندولال بہت مضطرب رہا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ لیکن یاسمین اچھی خاصی سٹرن ہو چکی تھی۔ وہ ہر وقت چپ رہتی اور خاوند کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی دونوں ایک ہی بنگلہ میں بیشک رہتے تھے مگر اجنبیوں کی طرح سے۔ مسٹر چندولال نے اسے منانا چاہا مگر اس نے معاف نہ کیا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ اور یاسمین ایسی ہو گئی جیسے مسٹر لال کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ اب خاوند کی آنکھیں کھلیں اور اس کے لئے زندگی وبال ہو گئی۔

ایک سال گزر گیا۔ آخر کار ایک دن وہ علی الصباح مارکیٹ گئی اور جب وہاں سے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری تھی۔ یہ ٹوکری اس قدر بھاری تھی کہ وہ مشکل سے چل سکتی تھی۔ وہ اپنے کمرے

میں گئی اور خاوند کو بلا بھیجا۔ خاوند آیا۔ مگر گھبرایا ہُوا۔ وہ خوفزدہ تھا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ یاسمین نے اس کی طرف دیکھا۔ اور کہا کہ میں باہر جا رہی ہوں کیا تم میرے ساتھ چل سکتے ہو وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ اور دونوں گاڑی میں بیٹھ کر قبرستان کے پھاٹک پر ٹھہرے۔ پہلے یاسمین گاڑی سے اُتری اور خاوند کو کہا یہ پھُولوں کی ٹوکری بہت بھاری ہے تم اُٹھا لو۔ پھر چشم پُر آب ہو کر بولی مجھے اس کی قبر پر لے چلو۔ مسٹر چندو لال حیرت زدہ پھُولوں کی ٹوکری لئے ہوئے آگے آگے ہو لیا اور اس کی مرمری قبر کے سرہانے ٹھہر کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ یاسمین نے قبر پر پھُول ڈالے اور بڑی دیر تک دُعا کرتی رہی۔ اس کے پیچھے اس کا شوہر دم بخود کھڑا ہُوا گزرے ہوئے زمانہ کو یاد کر رہا تھا۔ آخر یاسمین نے دُعا ختم کی اور کہا۔ "اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو میں صُلح کرنے کو تیار ہوں"

خناس

(۱)

ہندوستان میں آجکل کوئی کانگریس کا شیدا ہے تو کوئی کانفرنس کا عاشق زار۔ گزشتہ زمانہ میں جو محبت مجنوں کو لیلیٰ سے اور فرہاد کو شیریں سے تھی۔ اس سے کہیں زیادہ سودا آجکل کے پولیٹکل دیوانوں کو کانگریس اور کانفرنس کا ہے۔ اس لئے آج ہم ایک کانفرنس کا حال سناتے ہیں مگر ہماری کہانی ہندوستانی کانگریس یا کانفرنس کی سرگزشت نہیں ہے۔ بلکہ ہم جہنم کی کانفرنس کا ذکر کریں گے۔ بات یہ ہے کہ جب خدا کے گنہگار جان آفریں کو جان سونپ کر اور اس جہان فانی سے رخصت ہو کر دوزخ میں جاتے تھے تو وہاں جاکر اکثر یہی کہتے تھے۔ کہ ہماری بیویوں نے ہمیں اس نوبت کو پہنچایا ہے۔ یعنی ہماری سیہ کاری کی ذمہ وار ہماری بیویاں ہیں شہنشاہ دوزخ کو جس کو مصنفان مغرب پلوٹو اور سخن سنجان مشرق مالک کہتے ہیں۔

اعتبار نہ آتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بھلا عورت جسے مشرق میں شمع خلوت۔ محرم راز اور مونس و دمساز۔ اور مغرب میں بہترین نصف کہتے ہیں۔ کب مرد کو تباہ اور برباد کر سکتی ہے۔ یہ سراسر افترا اور تہمت ہے۔ مرد خود قصوروار ہیں۔ اور ناحق عورتوں کو بدنام کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ شکایت عام تھی۔ اس لئے پلوٹو نے بالآخر کونسل یہ فیصلہ کیا۔ کہ موکلان دوزخ میں سے کوئی جسے کونسل منتخب کرے پر وہ دنیا پر جائے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔ تاکہ حقیقت حال ظاہر ہو جائے ؏

(۲)

کونسل نے غور و تامل کے بعد شیطان یعنی عزازیل کے ایک بڑے عیار اور نامور چیلے کو جس کا نام ٹھیک معلوم نہیں ہو سکا مگر غالباً خناس تھا نامزد کیا۔ اُسے ایک لاکھ اشرفیاں دیں۔ اور حکم دیا کہ تم بہ شکل انسانی فوراً روئے زمین پر جاؤ۔ وہاں جا کر اپنی دلپسند عورت سے شادی کرو۔ دس سال اُس کے ساتھ بسر کرو اور اس عرصہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دوزخیوں کی شکایت کہاں تک صحیح ہے۔ دس سال کے بعد یہ بہانہ کر کے کہ تو مر گیا ہے۔ دوزخ میں واپس آ جاؤ اور ہمیں آگاہ کرو کہ آیا شادی باعث راحت ہے یا موجب زحمت ؏

خناس کو یہ خدمت ناگوار تھی۔ لیکن حکم مرگ مفاجات۔ چاروناچار

تیار ہو گیا۔ اور جب سامان سفر درست کر کے اجازت کے لئے شہنشاہ دوزخ کی خدمت میں حاضر ہُوا تو اُس نے کہا کہ دیکھ دُنیا ئے فانی ہیں چونکہ تو انسان بن کر رہے گا۔ تجھے تنگی۔ تُرشی۔ بیماری۔ ذلّت۔ وبا۔ قحط۔ قید اور بندی غرض ہر قسم کی مصیبت کو جو انسانوں پر آتی ہے۔ برداشت کرنا پڑے گا۔ ہاں اگر تو چاہے تو اپنی عقل اور کاردانی سے ان مصیبتوں سے اپنے آپ کو بچا سکے گا۔

(۳)

خنّاس نے دوزخ سے نکل کر تمام کُرۂ زمین کا چکّر لگایا۔ اگرچہ ارمنی یہودی اور ایرانی حسن اُسے بہت پسند آیا۔ اور انگلستان اور پیرس کے فیشن کو دیکھ کر وہ چکرا گیا۔ مگر ہندوستان کی ملاحت نے اُسے مبہوت کر دیا آخر وہ لاہور میں ایک دولتمند سوداگر بن کر سکونت پذیر ہُوا۔ سب کو معلوم ہے کہ تیرہ خاک ہند میں ذاتی جوہر کی کچھ حقیقت نہیں۔ یہاں لوگ زر کو خدا سمجھتے ہیں خناس جس کے پاس ایک لاکھ اشرفی تھی۔ بہت جلد مشہور ہو گیا۔ ادنےٰ اور اعلےٰ اس کی عزت کرنے لگے۔ اور اُس کی شادی ایک اُونچے گھرانے میں بڑی آسانی سے ہو گئی۔ خناس کا نام اب لاہور میں سری رام پلوپلے اور اُس کی بیوی کا اندر کور تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اندر کور خوبصورت تھی۔ حد سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اُس کا حُسن پریوں اور حوروں کو

شرماتا تھا۔ مگر جس قدر حسین تھی اُسی قدر غیور، بد دماغ اور فضول خرچ بھی۔ بدقسمتی سے انگلستان اور پیرس کی رہائش نے اس کا مزاج بگاڑ دیا تھا۔ وہ ہندوستانی لباس میں سو سو کیڑے ڈالتی تھی۔ اور فیشن کی اس قدر دلدادہ تھی۔ کہ یورپ کی خودسر عورتوں کی تقلید میں اپنے لمبے لمبے اور ریشمی بال بھی نذر مقراض کر چکی تھی +

(۴)

سری رام پوپلے یعنی خناس کو اس سے بہت محبت تھی۔ مگر وہ اسے اپنا غلام اپنا بردہ۔ اپنا کفش بردار سمجھتی تھی۔ عالیشان دو منزلی کوٹھی میں رہائش تھی۔ ضرورت سے زیادہ نوکر اور خدمتگار موجود تھے۔ لوگ ایک موٹر رکھتے ہیں۔ اُس کے ہاں نصف درجن کاریں تھیں۔ اور ہر ایک کا شوفر یعنی موٹر ڈرائیور علیحدہ تھا۔ ہر مہینے میں چار بار پارٹی دی جاتی تھی۔ جس میں مہمان سیکڑوں کی تعداد میں آتے تھے۔ اور زمانہ کے رنگ کے بموجب میزبان اور اُس کی خورشید نگار بیوی کی مدح سرائی کرتے تھے۔ اندرکور ہر پارٹی میں نئی پوشاک زیب بدن کر کے طاؤس طناز کی طرح جلوہ افروز ہوتی تھی۔ اور جو لباس ایک بار پہن لے۔ خواہ وہ کتنا ہی بیش قیمت ہو۔ پھر اُسے قابل استعمال نہ سمجھتی تھی +

اب اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ ایسے اسراف کے مقابلہ میں ایک لاکھ اشرفی کی کیا حقیقت تھی اس کے لئے تو گنج شایگاں اور قاروں کا خزانہ بھی مکتفی نہ

ہو سکتے تھے۔ سری رام پوپلے نے بیوی کو سمجھانا چاہا۔ مگر اُس کے سر نہ فیشن کا جن سوار تھا۔ مزید براں اُس کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ عورت بہترین نصف ہے اور آجکل کی تہذیب کی رو سے لازمی ہے کہ شوہر بیوی کا مزدور۔ بیوی کا قلی۔ بیوی کا بار بردار مویشی بن کر رہے۔ اِس لئے خاوند کی خیر خواہی سے بگڑ گئی۔ بگڑی کیا پیچھے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ گئی۔ اور اس قدر ذلیل کیا کہ پھر اُسے مجال شکایت نہ ہوئی +

(۵)

ایک لاکھا شرفی جاتی ہوئی دکھائی نہ دی۔ اب خناس حیران تھا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن چند ماہ تک امیری ٹھاٹھ میں فرق نہ آیا۔ چونکہ لوگ اُسے دولتمند سوداگر سمجھتے تھے۔ اِس لئے کچھ عرصہ اعتبار قائم رہا۔ اور ہنڈیوں پر روپئے جلا تامل ملتے رہے۔ مگر جب ہنڈیوں کی ادائیگی تاریخ مقررہ پر نہ ہوئی تو قصر اعتبار ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ گرا اور گرتے ہی مکان تاش کا مٹی کے کھلونے کی طرح چکنا چور ہو گیا۔ نتیجہ وہی ہُوا کہ جو ہُوا کرتا ہے۔ قرضخواہوں نے ڈگریاں کرالیں۔ اور جب قارق قرقی لے کر آئے تو معلوم ہُوا کہ کوٹھی اور کوٹھی کے سامان کی مالک اور قابض مسز سری رام پوپلے ہے۔ خاوند کا اس سے تعلق نہیں ہے۔ جب ساہوکاروں کو جو گرگ باراں دیدہ تھے۔ یہ صدمہ پہنچا تو انہوں نے خناس کو قید کرانا چاہا۔ اور وہ ایسا گھبرایا۔ کہ روپوشں ہو گیا۔

اتفّاق سے اس کے لین داروں میں ایک ساہوکار پیشہ وکیل تھا۔ یہ شخص بے ایمانی میں اس وقت لاثانی ہے۔ اور حقداروں کو محروم کرنا۔ جھوٹے پرونوٹ لکھوانا۔ ثالثوں کے ذریعہ فرضی ڈگریاں فریب دے کر حاصل کرنا۔ دس دے کر ہزار لکھوانا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ اگرچہ اس وقت اس کی رسّی دراز ہے۔ مگر بہت جلد خدا کا قہر اس پر نازل ہونے کو ہے۔ اور دُنیا دیکھے گی کہ وہ جو اسے بہت عزیز ہیں۔ اس کی زندگی میں اس سے جدا ہو جائیں گے۔ اور اس کی کمائی دوزخ کی آگ کا اس کو جلانے کے لئے ایندھن ثابت ہو گی۔ اس بے ایمان وکیل نے حکمت عملی سے معلوم کر لیا کہ خناس کہاں روپوش ہے۔ اور پیادے اور بیلف لے کر اُسے گرفتار کروانے وہاں جا پہنچا۔

(٦)

اب خناس کے گرفتار ہو جانے میں کوئی شک نہ تھا۔ پیادے اور قارق اُس گھر میں جہاں وہ چھپا ہوا تھا۔ داخل ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اتفّاق سے اس گھر کے ساتھ ایک نیم حکیم کا مکان تھا۔ اور درمیانی دیوار بہت اونچی نہ تھی۔ خناس دیوار پھاند کر نیم حکیم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اور اُسے اصلیّت سے آگاہ کر کے کہا۔ کہ اس وقت تم میری مدد کرو۔ میں تمہاری خدمت کروں گا۔ اور تمہیں دُنیاوی ضروریات سے بے نیاز کر دوں گا۔ دس سال ختم ہونے کو ہیں۔ تھوڑا

عرصہ باقی ہے۔ نیم حکیم بے ایمانی میں ساہوکار سے کچھ کم نہ تھا۔ دونوں ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے تھے۔ اگرچہ نیم حکیم۔ نے بھی اپنی چالاکیوں۔ چالبازیوں اور سازشوں سے چوروں کی بدولت بہت سارو پیہ جمع کیا ہوا تھا۔ مگر حرص اب بھی دامنگیر تھی۔ اِس لئے خناس کا طرفدار ہوگیا۔ اور وکیل اور اُس کے ہمراہیوں کو ایسا چکمہ دیا کہ وہ اپنا سامنہ لے کر واپس چلے گئے ؛

ان کے جانے کے بعد خناس نے حکیم کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ حکیم جی میری خلقت آگ سے ہے۔ مَیں ناری ہوں۔ مَیں کسی امیر کی بیوی کے سر پر سوار ہوتا ہوں۔ تم آج ہی اشتہار دیدو کہ آسیب دُور کرنے میں بھی تمہیں ید طولے حاصل ہے۔ امیر مجبور ہو کر تمہیں علاج کے لئے بلائیگا۔ تمہارے آتے ہی میں اُس کی بیوی کو چھوڑ دوں گا۔ اور تمہارا طوطی بولنے لگے گا۔ تمام دُنیا تمہارے تعویذ اور گنڈوں کی معتقد ہو جائے گی ؛

(۷)

شہر لاہور کے ایک امیر کو بیوی سے بڑی محبّت تھی۔ یہ شخص گو اب امیر تھا۔ مگر اس کے والدین بہت معمولی حیثیّت رکھتے تھے۔ ہم نے خود اُسے مسجد میں درویشوں کی طرح رہتے دیکھا ہے اُس وقت اس کا لباس نیلا تہہ بند اور ایک کُرتا ہُوا کرتا تھا۔ خدا کی شان دیکھو اب یہ بدشکل سیاہ رُو انسان گورنروں کو اپنے گھر مدعو کرتا ہے۔ اور اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتا۔ سچ ہے

خدا کی دین کا موسےٰ سے پُوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یکایک اس سیاہ فام امیر کی بیوی بیمار ہو گئی۔ نامی گرامی ڈاکٹر اور طبیب اور وید بلائے گئے۔ مگر کچھ افاقہ نہ ہُوا۔ آخر نیم حکیم جی کا اشتہار نہیں امیر کی کوٹھی میں لے گیا۔ نیم حکیم نے دم کیا ہُوا پانی مریضہ کو پلایا۔ اور وہ معاً اچھّی ہو گئی۔ امیر کی باچھیں کھل گئیں۔ معالج کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ پانچ سَو روپیہ نقد اور ایک دوشالہ نذر دیا۔ اور چند دن میں نیم حکیم کی دُکان اس قدر چمکی کہ وہ بھی لاہور کے رئیس بن گئے ۔

(۸)

خناس قرضخواہوں کے ڈر اور اپنی آتش مزاج نمرود سرشت بیوی کے خوف سے لاہور کیا ہندوستان چھوڑ کر کابل جا پہنچا۔ اور چونکہ فطرتاً شیطان تھا۔ محض دل لگی کے لئے سلطنت افغانستان کے کسی گورنر کی بیوی کے سر پر سوار ہو گیا۔ کابل کے اطبّا نے بڑی کوشش کی۔ مگر مطلب براری نہ ہوئی۔ نیم حکیم کے اشتہارات جن میں لاہور کے امیر کی تصدیق درج تھی، دُور دُور دورہ کر رہے تھے۔ ایک اشتہار کابل بھی پہنچ گیا۔ اور نیم حکیم پشاور کے حُکّام کی وساطت سے کابل بلائے گئے۔ وہاں گئے تو خناس نے بشکل انسانی انہیں مل کر کہا۔ کہ دیکھو نیم حکیم تُو نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ میں نے اُس کی

تلافی کر دی۔ معاہدہ یہ نہ تھا کہ جہاں میں جاؤں وہیں تو بھی بلائے ناگہانی کی طرح آموجود ہو۔ آخر تو ہندوستان سے افغانستان کیوں آیا۔ عیاری اور مکاری کے لئے ہندوستان تیرے لئے کم نہ تھا۔ بھلی نیت سے کوئی بہانہ کر کے یہاں سے چلا جا۔ ورنہ یہ گورنر تجھے قتل کر دیگا۔ کیونکہ میں اس پٹھانی کو ابھی نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ سُن کر نیم حکیم کا رنگ فق ہو گیا۔ تو اُس نے گورنر کے آگے ہاتھ جوڑ دئے۔ اور کہا کہ حضور مجھے علاج سے معاف رکھا جائے۔ یہ آسیب سخت قسم کا ہے۔ اور میرے تعویذ یہاں کام نہیں کر سکتے۔ یہ سُن کر گورنر جو خر دماغ افغان تھا۔ آگ بھبھوکا ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ او ہندی مردود تم ضرور علاج کرو۔ ورنہ ہم تم کو قتل کر دے گا۔

(۹)

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ نیم حکیم بھی ایک ہی کائیاں اور جھنجھلا لیا تھا۔ اُس نے گورنر کو کہا اچھا حضور جو میری قسمت میں ہے ہو گا کوشش کرتا ہوں۔ آپ حکم دیں کہ محل سرا کی تمام کنیزیں بہترین لباس پہن کر مریضہ کی چارپائی کے گرد بیٹھ جائیں۔ اور بلند آواز سے گائیں اور دف بجائیں۔ گورنر نے کہا بہت اچھا۔ یہاں تو حکم کی دیر تھی۔ کوئی پچاس پٹھانیاں مریضہ کی چارپائی کے گرد بیٹھ کر دف بجانے اور گانے لگیں۔ خناس نے حیران ہو کر حکیم سے پوچھا کہ او مردک یہ کیا پاجیانہ حرکت ہے۔ اس سے کیا فائدہ ہو گا۔

نیم حکیم نے بظاہر ترساں ولرزاں گویا خوف سے سخت ہراساں ہیں۔ کہا اے دوزخ کے سردار اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ کی زوجہ محترمہ لاہور سے بہ نفس نفیس کابل تشریف لے آئی ہیں۔ انہیں کے ایما سے یہ محفل گرم ہوئی ہے۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ بیوی کا نام سن کر خناس ایسا بولا کہ اس کے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا۔ کہ کہاں لاہور کہاں کابل۔ بھلا اس کی بیوی وہاں سے کیسے آسکتی ہے۔ گائے کی طرح کانپ گیا۔ اور گورنر کی بیوی کو چھوڑ کر وہاں سے ایسا بھاگا جیسے مسجد سے جوتا۔ اور اس وقت دم لیا جب مالک دوزخ کی حضوری میں حاضر ہوا۔ جب وہ دوزخ کی طرف بھاگا جارہا تھا تو راہ میں ایک بار بھی پیچھے پھر کر نہ دیکھا۔ نیم حکیم کے الفاظ دوزخ تک اس کے کانوں میں گونجتے رہے ؟

رمضان کبابی

(۱)

رمضان کبابی اپنے زمانہ میں لاہور کا مشہور غنڈا تھا۔ بلکہ یُوں کہیے کہ تمام شہر کے بدمعاشوں کا گرو گھنٹال۔ یُوں تو وہ موچی دروازے کے چوک میں ادہے کی انگیٹھی پر کباب سیخ بھون کر بیچا کرتا تھا۔ مگر شہر کے بڑے بڑے پارسوخ باشندے اس سے دبتے تھے اور ساہوکار تو اسے دیکھ کر گھئے کی طرح کانپ جاتے تھے۔ جس جگہ رمضان کباب بیچا کیا کرتا تھا وہیں ساتھ ہی ایک طباخی کی دُکان تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک مزدور طباخی کی دُکان پر آیا۔ اور دو روٹیاں لیں۔ اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگا۔ بدنصیبی سے مزدور جناب رمضان کو نہ جانتا تھا۔ اس لئے اُسے سلام نہ کیا۔ اس پر طرہ یہ ہُوا کہ کباب بھی نہ خریدے۔ لوگوں کا دستور تھا کہ کچھ تو کبابی کے خوف سے اور کچھ اسے خوش کرنے کو

جب طباخ کی دُکان سے روٹی خریدتے تو کباب بھی ضرور لیتے تھے! دہ دُکاندار ایک کباب ایک پیسہ میں دیتے تھے۔ مگر رمضان ایک کباب کا ایک آنہ لیا کرتا تھا۔ اور مشہور یہ کر رکھا تھا۔ کہ اس کے کباب دُنبے کی چکنی کے ہوتے ہیں۔ لوگ خوب جانتے تھے کہ وہ بکتا ہے۔ مگر کسے مجال تھی کہ رمضان سے مقابلہ کرے۔ جو ذرا اسی بات پر پینترا بدل کر شیر کی طرح جھپٹ پڑتا تھا۔

(۲)

جب مزدور رُوکھی روٹی کھا کر چلنے لگا۔ اور جاتے ہوئے بھی سلام نہ کیا تو رمضان جو بھرا بیٹھا تھا۔ آگ بھبھوکا ہو کر بل پڑا اور للکارا کہ ابے جاتا کہاں ہے۔ ٹھہر جا یہ اکڑنا اور بڑھنا کیا معنی۔ گردن جھکا کر کھڑا ہو ورنہ ابھی رُوئی کی طرح تُوم کر دھر دونگا۔ مزدور ایک کمزور اور منحنی آدمی تھا۔ اور رمضان دیو قد پہلوان غریب مزدور کی گھگھی بندھ گئی۔ چھکے چھوٹ گئے۔ گڑگڑا کر بولا کہ آپ کا کیا حکم ہے۔ رمضان کڑک کر بولا:۔

رمضان۔ "ابے او لاخبطہ لا دام"۔

مزدور۔ (حیران ہو کر) "کیسے دام سرکار"۔

رمضان۔ کبابوں کی خوشبو اور دھوئیں کے جن کے ساتھ تُو نے روٹی

کھائی ہے۔

مزدور۔ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ کباب میں نے نہیں کھائے۔ قیمے میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی البتہ بُوئے کباب اور دُھواں میرے دماغ میں ضرور پہنچا ہے۔ لیکن اس کی قیمت کون دیتا ہے۔ اگر میں یہاں بھی نہ ہوتا تو وہ اُڑ جاتا۔ انصاف فرمائیے کہ کیا آج تک کسی کبابی نے دھوئیں اور بُھنے ہوئے گوشت کی بُو کی بھی قیمت لی ہے۔

رمضان (جھلا کر) "ابے چوپنچ سنبھال مجھے جانتا ہے میں کون ہوں۔ ابھی وہ پٹخنی دونگا کہ چھٹی کا دُودھ یاد آجائیگا۔ میرا نام قضائے مبرم ہے پیام اجل ہے۔ بلائے بے درمان ہے۔ رمضان خاں پہلوان ہے۔ تُو نے روٹی کے ساتھ کبابوں کی خوشبو اور دُھواں کھایا ہے۔ اور یہ چیزیں مُفت نہیں دی جاتیں۔ تجھے قیمت ادا کرنی ہوگی۔ زبان بند کر اور جیب ٹٹول۔ اس مُفت کی ٹھائیں ٹھائیں سے کیا فائدہ"۔

یہ کہا اور زبردست آزار کبابی نے مزدور کو گردن سے پکڑ لیا۔

(۳)

موچی دروازے کے چوک میں شور مچ گیا۔ بھیڑ لگ گئی۔ آدمی پر آدمی گرنے لگا۔ لوگ جو پہلوان سے دبتے تھے مزدور کو سمجھانے لگے۔ کہ بھائی رمضان خاں کے مُنہ نہ چڑھو۔ اس نے سینکڑوں کو نیچا کیا ہے آپ کس

کھیت کی مولی ہیں۔ یہ شخص آفت ناگہانی ہے۔ اس سے نڈر او ر حاضرین میں سے بعض نے جو کسی قدر جری تھے پہلوان کو سمجھانا چاہا۔ مگر وہ تو جوش جوانی کے نشہ میں سرشار تھا جھلا کر جھپٹا اور ایک چپت غریب مزدور کے سر پر ایسی جمائی کہ بیچارے کا مغز بھنا گیا اور وہ ارارا کر دھم سے زمین پر آ رہا۔ لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ دیکھا تو وہ بیہوش تھا۔ بعض رقیق القلب اس کے پانوں سہلانے لگے۔ چند منٹ میں اسے ہوش آ گیا۔ مگر مزدور بھی عجیب ڈھیٹ تھا مار کھا رہا تھا۔ مگر جیب میں ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ یکایک سائیں دہوں ادھر آ نکلا۔ سائیں دہوں کا نام لاہور کے باشندے نہیں بھول سکتے۔ اُسے اس جہان سے رخصت ہوئے پچیس سال ہو گئے۔ لیکن اس کی شکل میری آنکھوں میں اب تک پھر رہی ہے۔ یہ ایک آزاد منش فقیر تھا۔ دراز قد۔ سیاہی مائل گندمی رنگ۔ سینہ فراخ اور جسم سانچے میں ڈھلا ہوا۔ یہ ہر وقت اور ہر موسم میں عریاں رہتا تھا۔ اس کا لباس صرف ایک سُرخ رنگ کا جانگیہ ہوا کرتا تھا۔ جس کے کناروں پر گوٹہ لگا رہتا تھا۔ یہ جانگیہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک رہتا تھا۔ داڑھی۔ مونچھیں۔ سر۔ اور ابرو منڈے رہتے تھے۔ اور جب چلتا تھا تو سانپ کی طرح بل کھاتا جاتا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں میں سونے کے چھلے اور انگوٹھیاں ہوا کرتی

تھیں ⁂

سائیں دھوں بھیڑ چیر کر وہاں آپہنچا۔ جہاں رمضان غریب مزدور کی گردن ناپے کھڑا تھا ⁂

سائیں "۔کیا معاملہ ہے" ⁂

رمضان "۔ یہ دام نہیں دیتا" ⁂

سائیں "۔ ارے کباب کھائے تو دام کیوں نہیں دیتا" ⁂

مزدور "۔ سائیں میں نے کباب کھائے بھی ہوں" ⁂

سائیں "۔ پھر بات کیا ہے" ⁂

رمضان ۔کباب تو نہیں کھائے۔ مگر روٹی کے ساتھ کبابوں کا دھواں تو کھایا ہے کیا میں کبابوں کی خوشبو اور دھوئیں کے دام نہ لوں اور مفت دیدوں۔ سائیں دھون جی آپ ثالث بن کر فیصلہ کر دیں۔ ہمیں منظور ہے ⁂

سائیں "۔ کیوں بھائی مزدور تو مجھے ثالث مانتا ہے" ⁂

مزدور "۔ مجھے آپ کا فیصلہ سر آنکھوں سے منظور ہو گا" ⁂

سائیں "۔ مگر ثالث کے فیصلہ کی اپیل نہیں ہو سکتی" ⁂

مزدور "۔ مجھے آپ کا فیصلہ ہر حال میں منظور ہے" ⁂

سائیں "۔ پہلوان صاحب میرا فیصلہ آپ کو بھی منظور ہو گا" ⁂

فیصلہ ثالث

مدعی کا دعوےٰ یہ ہے کہ مدعا علیہ نے اس کے کباب نہیں کھائے لیکن دُھواں ان کا اور بُو ئے کباب کھائی ہے اِس لئے قیمت دلائی جائے۔ لیکن مدعا علیہ نے قیمت ادا کر دی ہے کیونکہ اس نے روپیہ نہیں دیا۔ روپے کی جھنکار مدعی کو سُنا دی ہے۔ مدعی تسلیم کرتا ہے کہ روپیہ جس کی جھنکار دی گئی ہے کھرا تھا۔ چونکہ بُوئے کباب اور دھوئیں کی قیمت بذریعہ جھنکار ادا ہوگئی ہے اب کوئی دعوےٰ نہیں رہا۔ ہم دعوےٰ خارج کرتے ہیں اور خرچہ فریقین بذمہ فریقین عائد کرتے ہیں۔ مدعا علیہ اور حاضرین رخصت ہوں ٭

یہ عجیب و غریب فیصلہ سُن کر حاضرین اس قدر خوش ہوئے کہ تالیاں بجانے لگے۔ مزدور دُعا دیتا ہوا رخصت ہُوا۔ پہلوان بمصداق دبی بلّی چُوہے سے چکراتی ہے۔ خاموش انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر کبابوں کے پہلو بدلنے لگا۔ اور سائیں دھوں سانپ کی طرح بل کھاتا ہُوا نظروں سے غائب ہو گیا ٭

پہلوان :- "کہہ تو رہا ہوں کیا اقرار نامہ لکھ دوں منگاؤ اسٹام"۔

سائیں :- "بھائی مزدور تیری جیب میں کیا ہے"؟

مزدور۔ (گھبرا کر) "ایک روپیہ ہے"۔

سائیں :- "جیب میں ہاتھ ڈال۔ نکال اور مجھے دے"۔

مزدور کے ہوش اُڑ گئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا وہ سائیں دہوں کو ثالث مقرر کر چکا تھا۔ چارو ناچار روپیہ جیب سے نکالا اور سائیں دہوں کے ہاتھ میں دیدیا۔ رمضان کی باچھیں کھل گئیں۔ لوگ حیران اور دم بخود کھڑے تھے۔ فیصلۂ ثالث کا انتظار کر رہے تھے۔ سائیں نے روپیہ دیکھا۔ زبان سے چکھا۔ پرکھا۔ سُونگھا۔ اور پھر مزدور کو واپس دے کر کہا کہ "روپیہ کھرا ہے۔ کھوٹا نہیں ہے۔ اب تو اُسے زمین پر دس دفعہ پھینک اور اچھی طرح آواز سُنا"۔

مزدور نے ثالث کے حکم کی تعمیل کی۔

سائیں :- "کیوں پہلوان روپیہ کھرا ہے یا کھوٹا"؟

رمضان :- "کھرا ہے اسے کھوٹا کون کہہ سکتا ہے"۔

سائیں دہوں نے کھانس کر پہلے تو گلا صاف کیا۔ اور پھر بلند آواز سے اپنا فیصلہ اس طرح سُنایا۔

آخری پرواز

(۱)

کالج کے زمانہ میں ہری چند اور رام سروپ میرے ہم جماعت میرے ہمدم اور یار غار تھے ہم تینوں کو ریاضی سے مذاق نہ تھا۔ ریاضی کے گھنٹے میں پروفیسر ساسی بھوشن مکرجی ایم اے۔ بی۔ ایل کی آنکھ بچا کر ہم باری باری چپکے سے جماعت کے کمرے سے نکل کر اس برج میں جس میں گھڑی لگی ہوئی تھی جا بیٹھتے اور بیت بازی کیا کرتے تھے۔ آہ! کیا اچھا زمانہ تھا اب یاد آتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اور دل میں درد اٹھتا ہے۔ ہری چند کو جس قدر ریاضی سے نفرت سی رہتی تھی نقشہ کشی اور مصوّری سے رغبت تھی اور رام سروپ فوٹو گرافی کا عاشق تھا۔

کالج چھوڑ کر رام سروپ فوٹو گرافر بن گیا اور اس فن میں اس کی شہرت آفتاب نصف النہار بن گئی۔ رام سروپ ہوائی فوج کے محکمہ

میں داخل ہو کر ایک کارواں اور ماہر ہوا باز ثابت ہُوا ہوائی جہاز کی دوڑ میں اس نے کئی تمغے حاصل کئے اور انعام لئے۔ بلند پروازی میں بڑا نام پایا مگر عورتوں کی مجلس سے وہ بہت گریز کیا کرتا تھا اور اس لئے تیس برس کی عُمر تک شادی نہ کی کوارا رہا ؛

(۲)

ایک دن کا ذکر ہے کہ مَیں ہری چند کے ہاں گیا اس وقت دیوان خانہ خالی تھا وہ حمام میں تھا۔ مَیں اس کے کمرے میں بیٹھ گیا اور دیکھا کہ اس کی میز پر کسی عورت کی تصویر تھی جو اس نے رنگدار کھریا کی پنسل سے بنائی تھی۔ تصویر کا چہرہ نہایت خوبصورت بلکہ ملائیک فریب تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس میں کوئی بات اِس قسم کی تھی جو ارضی حسن یا دُنیائے فانی کی خوبصورتی میں نہیں ہوتی بلکہ سایوں یا آسیب میں پائی جاتی ہے۔ اور جس سے طبیعت میں ایک قسم کا اضطراب پیدا ہوتا تھا۔ مَیں اِس تصویر کو دیکھ رہا تھا کہ ہری چند داخل ہُوا اور میں نے ازراہِ مذاق کہا کہ خوب آخر کار دل کسی پر آ ہی گیا۔ کہنے کو تو مَیں نے یہ کہہ دیا مگر ساتھ ہی میں اپنی بیقراری جو اس خوبصورت مگر بھیانک تصویر کا اثر تھا چُھپا نہ سکا۔ ہری چند نے جب دیکھا کہ مَیں تصویر دیکھ رہا ہوں تو اس کا رنگ فق ہو گیا ؛

(۳)

"یہ کون ہے؟" میں نے از راہ تمسخر پوچھا۔ "ہاں کوئی ہے۔" اس نے تجاہل عارفانہ سے جواب دیا۔ تصویر میرے ہاتھ سے لے لی۔ اس کی طرف دیکھا۔ ماتھے پر بل ڈال کر اُسے میز کے دراز میں بند کر کے قُفل لگا دیا۔ اور یہ خیال کر کے کہ وہ اس تصویر کا راز مجھ سے چھپانا چاہتا ہے میں اور باتیں کرنے لگا اور کہا کہ یار اب تو تمہاری تعریف میں اخباروں کے کالم سیاہ ہو رہے ہیں تمہاری پچھلی پرواز نے تمہاری شہرت کو چار چاند لگا دیئے تم نے تو سب کو مات کر دیا۔ اتنی بلندی پر آج تک کوئی ہوا باز اپنا ہوائی جہاز نہیں لے گیا۔ اس نے بات کاٹ کر خود ہی مجھ سے کہا۔ "تمہارا اس تصویر کے متعلّق کیا خیال ہے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا خیال کیا ہے۔ یار خبردار رہنا ورنہ کوہ تجرید سے سر کے بل گرو گے اور تمہارا عہد ہے کہ ساری عُمر شادی نہ کرو گے شرابی کی توبہ کی طرح ٹُوٹ جائیگا۔" میرا جواب سُن کر وہ کانپ اُٹھا اور اس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے آثار اس قسم کے نمودار ہوئے کہ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ مگر اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور ہکلاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "نہیں نہیں یہ خیالی تصویر ہے۔ کسی خاص عورت کی نہیں ہے۔" اس کے جواب سے مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے متعجب ہو کر کہا کہ اگر یہ خیالی تصویر ہے تو پھر تم اپنے وقت کے مانی اور بہزاد ہو +

(۴)

تھوڑی دیر کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کے گھر سے چلا آیا اور اس تصویر کو بھول گیا چند دن کے بعد میں نے اشتہار دیکھا کہ اتوار کے دن مسٹر ہری چند پریڈ کے میدان سے اپنے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اُڑیں گے اور وہ چاہتے ہیں کہ وہاں تک جائیں جہاں آج تک کوئی نہیں گیا وہ ریکارڈ کو توڑنا اور تمام ہوا بازوں اور غبارہ نوازوں پر اپنا سکّہ جمانا چاہتے ہیں۔ اس پرواز کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی اور مقررہ وقت سے بہت پہلے تمام میدان تماشائیوں سے بھر گیا۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی پھر بھی لوگ جوق جوق اور گروہ در گروہ دوڑے آ رہے تھے اور تماشائیوں میں ہندوستان کا مشہور و معروف فوٹو گرافر رام سروپ اپنا قیمتی اور لاجواب کیمرہ لئے بھی موجود تھا۔ آخر کار ہری چند ہوا بازوں کی وردی میں نمودار ہُوا۔ اگرچہ تماشائی ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ مگر ہری چند ہوائی جہاز میں سوار ہونے سے پہلے سیدھا وہاں آیا جہاں رام سروپ کیمرہ لئے کھڑا تھا اور مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں حیران ہُوا کہ اس نے اس جم غفیر اور مجمع کثیر میں ہمیں کیسے دیکھ لیا۔ اس وقت میں نے ہنسی ہنسی میں کہا کہ یار ہری چند کیا آج اوج عیوق تک جاؤ گے اور فرشتوں سے ہاتھ ملاؤ گے۔

وہ بظاہر ہنس دیا مگر اس کا چہرہ اس وقت خلاف معمول زرد تھا اور اگر

میری آنکھوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو وہ اس وقت کانپ رہا تھا۔
میں نے متعجب ہو کر کہا کہ اس گرمی کے موسم میں تمہیں جاڑا لگ رہا ہے۔
یہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے جواب میں صرف اتنا کہا "نہیں تو" اور ہوائی جہاز
میں جا بیٹھا اور جہاز آہستہ آہستہ زمین سے اُٹھنے لگا۔ مجھے خُوب یاد
ہے کہ اس وقت میرے اور رام سروپ کے کانوں میں ہنسی کی آواز آئی۔
مگر یہ ہنسی کسی مرد یا بچّہ کی ہنسی نہ تھی جسے قہقہہ کہتے ہیں بلکہ یہ ہنسی نہایت
دلکش اور سہانی چاندی کی ننھّی سی گھنٹی کی آواز تھی ؎

(۵)

جہاز زمین سے اُٹھ رہا تھا ہری چند اور اس کا پُرانا ملازم رام رکھا جو
پرواز میں ہمیشہ اپنے آقا کے ہمراہ اُڑتا تھا ہمیں نظر آرہے تھے۔ رام سروپ
کیمرہ جمائے اپنے کام میں مصروف تھا اور فوٹو لے رہا تھا کہ رفتہ رفتہ ہوائی جہاز
تارا ہو گیا اور پھر اس قدر بلند ہُوا کہ سب کی نگاہوں سے غائب ہو گیا۔
بڑی دیر کے بعد جب تماشائیوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا اور وہ مایوس
ہو کر گھروں کو جا رہے تھے تو ہری چند کا ہوائی جہاز نیلگوں آسمان کی فضا
میں نظر آیا۔ پہلے تو وہ ایک ٹڈّی کے برابر تھا پھر چیل کے برابر اور آخر کار
صاف دکھائی دینے لگا اور جب قریب آگیا تو رام سروپ نے دُوسرا
فوٹو لیا۔ لوگ جہاز کی طرف دیکھ رہے اور چلّا رہے تھے کہ وہ آیا وہ آیا۔

جہاز نہایت آہستگی سے اِس طرح آسمان سے زمین کی طرف آ رہا تھا۔ گویا ہوا باز کے قابو میں ہے۔ اور اس کی مشین نہایت درستی سے کام کر رہی ہے لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب جہاز نے زمین پر قیام کیا اور ہم سب اپنے محبوب ہوا باز کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھے تو جہاز بالکل خالی تھا اس میں ہری چند کا نشان تک نہ تھا۔

(۶)

یہ حال دیکھ کر سب بُت بن گئے۔ کچھ دیر کے بعد رام رکھا دکھائی دیا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتا ہُوا مشین سے باہر نکلا۔ چاروں طرف سے اِس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ مگر وہ اِس وقت گنگا اور بہرہ تھا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دائیں بائیں گھما رہا تھا یکایک وہ تیورا کر گرا اور بیہوش ہو گیا۔ لوگ اُسے ہاتھوں ہاتھ اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ اور ہم میدان سے افسردہ دل لوٹے۔ رام سروپ مجھے اپنے ہاں لے گیا۔ چائے پلائی اور جب حواس بجا ہوئے تو عکسی تصویریں دھوئیں اور جب دھو چکا تو کہا ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا تم نے توجہ نہیں کی جس وقت ہوائی جہاز آسمان سے زمین کی طرف اُتر رہا تھا تو مشین کا پہیہ بالکل متحرک نہ تھا۔ وہ تو اس طرح پیوستہ تھا کہ جیسے کسی نے کیلوں سے ٹھونک کر جما دیا ہے۔ مگر مشین پہیئے کی خرابی پر بھی اِس طرح اُتر رہی

تھی جیسے صحیح اور سالم ہے۔

(۷)

رام سروپ نے دونوں فوٹو میرے ہاتھ میں دیدیئے۔ عالم نزول کا فوٹو معمولی تھا اس میں کوئی بات خلاف معمول نہ تھی البتہ حالت صعود یعنے پرواز کا فوٹو انوکھا تھا۔ غور سے دیکھ کر معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کو گھیرے ہوئے تصویر میں جو دھند ہے اس میں ایک عورت کا چہرہ نظر آرہا ہے۔ چہرہ خوبصورت اور انسانی ہے۔ مگر ساتھ ہی عجیب غیر حقیقی، ہوائی پُر آسیب اور بھیانک مزید غور کرنے سے میں نے اور رام سروپ نے بھانپا کہ ایک عورت جس کے بال کُھلے ہوئے تھے دُھند اور بخارات میں جہاز کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہی تھی۔ اور جب میں نے پہچانا کہ یہ وہی عورت تھی جس کی تصویر مسٹر ہری چند نے کھریا کی پنسل سے بنائی اور اسے خیالی تصویر کہہ کر مجھ سے چھپایا تھا۔ تو میرا خون خشک ہوگیا اور میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے میرا یہ حال دیکھ کر رام سروپ نے تصویر اُٹھا کر آگ میں ڈال دی جس وقت تصویر جل رہی تھی تو ہم دونوں نے پھر وہی پُراسرار ہنسی سُنی۔ جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔

مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن

بچّوں کی الف لیلہ

بچّوں کے لئے نہایت دلچسپ سبق آموز کتابوں کا سٹ

مولفہ ایم - اسلم

نام کتاب	تفصیل کتاب وقیمت
جادوگر	شہزادہ ٹڈا اور شہزادی چھپکلی کی کہانی - بدصورت سے خوبصورت بن جانا۔ جادوگر کا سچ مچ انہیں ٹڈا اور چھپکلی بنا دینا - جادوگر کی موت - شہزادہ اور شہزادی کا پھر اصلی صورت پر آجانا - دونوں کی شادی تقطیع ۵×۷½ انچ - حجم ۴۲ صفحے - قیمت پانچ آنے
بہن کی محبت	چار شہزادے اور ایک شہزادی - شہزادوں کا سفید کوّے بن جانا - شہزادی کا جدائی میں رونا - ایک بادشاہ کی شہزادی سے شادی - بادشاہ کی پہلی بیگم کا اُسے بھڑکانا - بہن کا بھائیوں کی محبت میں مصیبتیں جھیلنا - شہزادوں کا کوّوں سے انسان بن جانا اور بہن سے ملنا - تقطیع ۵×۷½ انچ - ۵۰ صفحات قیمت چار آنے
بادشاہ بنوں گا	بھولا فیروز اور اس کے دو سوتیلے بھائی - بھائیوں کا اس کو مارنا پیٹنا - فیروز کا تکیہ کلام "میں بادشاہ بنوں گا" اس کی بدولت بھائیوں کا مالدار ہونا - جادو کے دسترخوان، ڈبیہ اور تھیلی کا فیروز کے ہاتھ لگنا اور اس کا بادشاہ بننا - تقطیع ۵×۷½ - ۴۸ صفحات - قیمت چار آنے

تاج کمپنی لمیٹڈ - قرآن منزل - ریلوے روڈ لاہور

نام کتاب	تفصیل کتاب و قیمت
سوتیلی بیٹی	غریب موتی پر سوتیلی ماں کا ظلم۔ غیب سے موتی کی امداد۔ ایک شہزادے سے اس کی شادی۔ موتی کے لئے طوطا خریدنا۔ سوتیلی ماں کا موتی کو دریا میں گرا دینا۔ بھوتوں کا اُسے ڈوبنے سے بچا لینا اور بطخ بنا دینا۔ بطخ کا محل میں آ کر طوطے سے باتیں کرنا۔ موتی کا پھر اصلی صورت پر آ جانا۔ ایسے دلچسپ حالات ہیں جن کے مطالعے سے بچے خوش ہوتے ہیں۔ صفحات ۴۴۔ قیمت چار آنے
شہزادی ڈیلیا	ڈیلیا کے باپ کا قتل۔ بیگم اور شہزادی کا قید ہونا۔ سفید پری کا چوہیا بن کر شہزادی کی قید سے چھڑانا۔ کالی پری کا ڈیلیا کو اُٹھا لے جانا۔ سفید پری کا شہزادی کو ڈھونڈ نکالنا۔ تقطیع ۵ × $\frac{1}{2}$ ۷۔ حجم ۴۶ صفحے۔ قیمت چار آنے
نارنج شہزادی	ایک شہزادے کا خواب۔ نارنگی کو چھیلنے پر اس سے ایک خوبصورت لڑکی کا نکلنا۔ نارنج شہزادی کی تلاش۔ اس کا مل جانا۔ جادوگرنی کا شہزادی کو چنڈول بنا دینا۔ چنڈول پھر نارنج شہزادی بن جانا۔ شہزادے اور شہزادی کی شادی۔ تقطیع ۵ × $\frac{1}{2}$ ۷، حجم ۴۶ صفحے۔ قیمت چار آنے
پری زاد شہزادی اور شہزادی نیلوفر	شہزادی نیلوفر کے باپ کا ایک دولتمند چڑیل شہزادی کے ساتھ شادی کرنا۔ چڑیل کا نیلوفر کو تکلیف دینا۔ بہزاد شہزادے کا شہزادی نیلوفر کو ہر مصیبت میں امداد دینا۔ شہزادی اور شہزادے کی شادی۔ حجم ۴۶ صفحات۔ قیمت پانچ آنے